باہتمام مرزا مرتضیٰ حسین منیجر

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

مسئلہ خلافت و امامت (۱)

(۱)

(ایک غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے)

"محترم مدیر نگار" میں ایک عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک آپ نے اسی مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعت اسلامی کے ہر فرد کی اولین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیعہ سنی کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہوں، لیکن میں نے ہمیشہ جماعت اسلامی کے ان دونوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اسوقت تک کیوں اس تفریق کے مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

(۱) نگار مارچ ۳۵ء

امامیہ مشن کی تینتالیسویں دینی خدمت
۴۳

مسئلہ خلافت و امامت

رسالہ نگار لکھنؤ میں جو ملک کے موقر ادیب جناب نیاز فتحپوری کی ادارت میں نکلتا ہے مارچ ۳۵ء سے ایک سلسلہ تحقیقی مضامین کا جاری ہے جو مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق ایک نادر ذخیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی تمام متعلقہ کڑیوں کو ایک منتظم نظام کے ساتھ دنیائے علم میں محفوظ کریں جس سے آیندہ نسلوں تک کو آب مختتم نتیجہ تک پہونچنے میں آسانی ہو۔

بحالت موجودہ اس سلسلہ کا پہلا حصہ شایع ہو رہا ہے اور بقیہ حصص بھی انشاء اللہ عنقریب ہدیۂ ناظرین کئے جا سکینگے۔ والسلام

خادم مذہب
سید محمد رضا نقوی
سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

رجب ۱۳۵۵ھ

بہ حیثیت عہدہ، بہ حیثیت منصب، بہ حیثیت فرائض، بہ حیثیت اخلاق و اعمال اور بہ حیثیت مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔

ایک شاعر کا جانشین شاعر، طبیب کا جانشین طبیب، قاضی کا جانشین قاضی، اور وکیل کا جانشین وکیل ہوا کرتا ہے۔ ایک شاعر کی جگہ حکیم اور حکیم کی جگہ قاضی اور قاضی کی جگہ وکیل سے پر نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک ہی نوع میں صنف کے بدلنے سے بھی خصوصیت مختلف ہو جاتی ہے، یعنی خود شعرا میں مرثیہ گو کا جانشین غزل گو اور غزل گو کا جانشین قصیدہ گو نہیں سمجھا جا سکتا چہ جائیکہ شاعر کی جگہ لوہار اور قاضی کی جگہ معمار صحیح جانشین سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "خلیفہ" حقیقتاً وہ ہے جو اپنے کمالات و خصوصیات میں اپنے پیشرو کے کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ شریک و حصہ دار ہو۔

اس نظریہ کے ماتحت ہمارے سامنے قدرتاً یہ تنقیح پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافت نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی

ممکن ہو آپ نے مسئلہ خلافت و امامت پر صرف اسلئے اظہار خیال نہ کیا ہو کہ یہ
نزاع عرصہ سے چلی آ رہی ہے اور اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ماضی کا
عقدۂ لاینحل مستقبل و حال میں بھی بدستور معمہ بنا رہے، بہر حال میں عرصہ سے متمنی تھا کہ
آپ کے خیالات اس باب میں معلوم کروں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھی کہ خود
اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آپکے سامنے پیش کروں اور اگر آپ کو اُس سے اختلاف یا
اتفاق ہو تو "باب المراسلۃ والمناظرہ" کے وساطت سے جو غالباً اسی غرض کے ساتھ
نگار میں قائم کیا گیا ہے آپ مجھے جواب دیسکیں۔

آپ دیکھیں گے کہ میں نے اس مقالہ کی طیاری میں تاریخ اسلامی کے اصل ماخذ کو
سامنے رکھا ہے اور اس لئے مجھے اُمید ہے کہ جواب دینے میں آپ بھی اس کا التزام
رکھیں گے۔ "بے نام"

فلسفہ کے کیسے کیسے عمیق مسائل طے ہو گئے، ریاضی کے کیسے کیسے دقیق نظریے
حل ہو گئے؛ نظام بطلیموسی کی جگہ نظام فیثاغورس نے لیلی، نیوٹن کے نظریہ کشش کو
آئنسٹائن نے بدل کر رکھدیا، لیکن خلافت کا جھگڑا مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو
برس گذرنے کے بعد بھی اسی طرح اُلجھا ہوا پڑا ہے۔

"خلافت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "جانشینی یا قائم مقامی"
کے ہیں لیکن "جانشینی" کا مفہوم صرف جگہ پر بیٹھ جانا نہیں ہے، بلکہ جانشینی"

پاگیا تھا۔

واقعات سے بھی اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عفیف کندی کی روایت ملاحظہ ہو:۔

"میں تاجر تھا، حج کے لئے مکہ آیا تو عباس ابن عبدالمطلب کی ملاقات کو جایا کرتا تھا، ایک دن انکے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہوگیا۔ اسکے بعد ایک خاتون پردہ سے باہر آئیں اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہوگئیں، میں نے عباس سے پوچھا یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ محمد ابن عبداللہ ہیں۔ میں نے پوچھا وہ خاتون کون ہیں کہا ان کی بیوی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن نوعمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی انکے ساتھ مصروف عبادت ہوگیا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟۔ عباس نے کہا کہ یہ محمد کا چچازاد بھائی علی ہے۔ میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں۔ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمد کا خیال ہے کہ خدا نے ان کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت تک سوائے انکی بیوی اور چچازاد بھائی کے کسی نے ان کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود محمد کا خیال ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کریں گے"۔

عفیف اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے اور کہا کرتے تھے کہ " لو کان رزقنی الاسلام یومئذ کنت ثانیا مع علی ابن ابی طالب (یعنی اگر مجھے ان

خلافت کے لئے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا، لیکن اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آیئے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ اُن کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر تفوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصب نبوت ملنے کے بعد آنحضرت نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتدا کی ہو گی جن میں جناب خدیجہ اور علی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور۔ اگر اہل سنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیر کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب[۱] میں لکھتے ہیں:

الموجح انہ اوّل من اسلم

یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے۔ اسی کتاب کے باب الالقاب[۲] سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ ایک خطاب ہی "سابق العرب" (اہل عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا) قرار

---

[۱] مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۴۸۔ [۲] تقریب التہذیب صفحہ ۴۳۱

یوازرنی علی ہذا الامر علیٰ ان یکون اخی، ووصیی و خلیفتی فیکم -

خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس کی دعوت دوں۔ پھر کون ہے جو اس امر میں میرا ساتھ دے تاکہ وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے

یہ سنکر مجمع پر خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ آخرکار علیؑ اٹھے اور بآواز بلند کہا کہ "انا یا نبی اللہ ان اکون وزیرک علیہ" (اے رسول اللہ میں آپ کی اعانت و ہمدردی کیلئے آمادہ ہوں)۔ حضرتؐ نے یہ سنکر فرمایا "ان ہذا اخی ووصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوہ" (دیکھو یہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی بات سننا اور اسکی اطاعت کرنا چاہئے)[1]

چلئے معاہدہ ہوگیا، قرار داد پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی، علیؑ نے بیعت کی، رسولؐ نے بیعت لی، کس بات پر؟ نصرت اسلام پر اعلاء کلمۃ الحق پر اور رسولؐ نے اسی وقت اپنی خلافت وجانشینی کا مسئلہ بھی طے کردیا۔

بیشک اگر خود علیؑ اس کے بعد اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے اپنے قرار دوفا

[1] تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷۔ ابوالفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۲ لباب التاویل خازن بغدادی مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۶ معالم التنزیل برحاشیۂ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۵ -

مجھے اسلام لانے کی توفیق ہو جاتی تو علیؑ کے بعد دوسرا میں ہوتا۔)

اس روایت کو علامہ ابن عبدالبر قرطبی نے استیعاب[1] میں، ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ[2] میں۔ ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر[3] میں اور ابن اثیر نے کامل[4] میں درج کیا ہے۔

یہ اُسوقت کی بات ہے جب آنحضرت مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے لیکن جب آیت " وانذر عشیرتک الاقربین " نازل ہوئی اور ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت نے اپنے اقربا اور اولاد عبدالمطلب ہاشم کو جمع کیا اور اس وقت جو تقریر آپ نے کی وہ خلافت کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لئے حل کر گئی۔ ارشاد ہوتا ہے:-

یا بنی عبد المطلب انی واللہ ما اعلم شابا فی العرب جاء قومہ بافضل مما قد جئتکم انی قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ ان ادعوکم الیہ فایکم	اے فرزندان عبدالمطلب باور کرو کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے اپنی قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا ہو۔ جو میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں دنیا اور آخرت کی بہتری کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور

[1] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن جلد ۲ صفحہ ۴۲۵ [2] مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۱۳ [3] مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲ [4] جلد ۲ صفحہ ۲۰ -

(تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میری سبز چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ)
کتنا سخت مرحلہ تھا کیسی شوار گذار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جان نثاری
و وفاداری کا عہد و پیمان کر چکا تھا، اپنی جان دینے کے لئے چادر تان کر
سو رہا اور رسالتمآبؐ تشریف لے گئے۔
قسطلانی نے کہا ہے۔
"فکان اول من شری نفسہ" (وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے
اپنی جان بیچ ڈالی[1])
امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ اس موقعہ کے لئے علیؑ کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔
"ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ" (ایسے
بھی لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں۔)
اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالتمآبؐ اپنے بعد علیؑ کو اس لئے چھوڑ
گئے تھے کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہ کے پاس تھیں واپس کر دیں[3]۔
آنحضرتؐ کی معیت میں حضرت ابوبکر تشریف لے گئے اور غار میں پناہ
لی، جب کفار قریش تعاقب میں یہاں تک پہونچ گئے تو حضرت ابوبکر کو فکر

---

[1] مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۸۷۔ [2] تاریخ خمیس جلد ا صفحہ ۳۶۷۔ [3] ابوالفداء جلد ا صفحہ ۱۲۶۔ تاریخ خمیس دیار بکری جلد ا صفحہ ۳۶۶۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۹۔ مواہب لدنیہ قسطلانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ا صفحہ ۹۰۔

میں ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہد نصرت میں کمزور ثابت ہوتے، تو یہ معاہدہ
کبھی کالعدم ہوجاتا، لیکن چونکہ آپ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں
طور پر اسی طرح قائم رہتی ہیں اس لئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ
منسوخ ہوگیا۔

اب آئیے اس کی تحقیق بھی کرلیں کہ آپ نے کسی وقت کوئی کمزوری
تو نہیں دکھائی، اعانت رسول سے کبھی منہ تو نہیں پھیرا اور جو قول و
قرار ایک بار ہوچکا تھا اس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا۔

یہ امر تاریخ اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسول اللہ
نے تبلیغ شروع کی تو کفار کی ایذا رسانیاں بڑھنے لگیں، آپ کے قتل کی تدبیریں
ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہوگئی۔ چنانچہ حد یہ ہے
کہ قبائل عرب میں سے چند لوگ اس بات پر تل گئے کہ گھر کا محاصرہ کرکے آپ کو
قتل کر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا! اور ایسے وقت میں
مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا، لیکن رسول اللہ جانتے تھے کہ کون کام آنے والا
ہے اس لئے آپ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کرلیا اور
کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے آپ نے جناب امیر سے یہ خیال ظاہر
کرکے کہا کہ۔

نم علی فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیہ

خدا کی معیت بھی ہو گی۔

غار والی آیت میں سب سے زیادہ قابل غور آخری الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبی پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں ان کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر جناب ابو بکر کے اطمینان و سکون کو بھی ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو (علیٰ رسولہ) کے بجائے (علیہما) ارشاد ہوتا۔

بہر حال اس واقعۂ ہجرت و واقعۂ غار میں حضرت علیؑ نے جس ایثار و قربانی جس دلیری و بے نفسی کا ثبوت دیا وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابو بکر کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اب اور آگے چلئے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرت نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارا انھیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصائل کے لحاظ سے باہم گر بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابو بکر کو حضرت عمر کے ساتھ بھائی بھائی قرار دیا، حضرت حمزہ کو زید ابن حارثہ کے ساتھ، حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ، زبیر کو ابن مسعود کے ساتھ، عبیدہ ابن حارث کو بلال کے ساتھ مصعب بن عمیر کو سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ، ابو عبیدہ جراح کو سالم مولیٰ بنی حذیفہ کے ساتھ اور سعید ابن زید کو طلحہ کے ساتھ۔ رہ گئے علی سو ان کا

دامنگیر ہوئی، آنحضرت نے فرمایا، رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے۔

ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لاتحزن ان اللہ معنا، فانزل اللہ السکینۃ علی رسولہ ؕ	وہ وقت جب ہمارا رسول اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تھا اور وہ دونوں غار میں تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے کہتا تھا غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو خدا نے اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسولؐ پر۔

اس واقعہ پر حضرت ابوبکر کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں کہ خدا نے انھیں (صاحب) کے لفظ سے یاد کیا اور آنحضرت نے (ان اللہ معنا) کہکر اپنے ساتھ اُن کو بھی شامل کر لیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ (صاحب) یا ساتھی سے یاد کرنا جبکہ وہ واقعی ساتھ ہو کس فضیلت کو ثابت کرتا ہے، لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن و غیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب) اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اذ قال لصاحبہ وھو یحاورہ اکفرت بالذی خلقک

الغرض ایک ساتھی کو ساتھی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کوئی فضیلت ظاہر ہو۔ رہا خدا کا ساتھ ہونا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسولؐ ہوں گے وہاں

اس کا تذکرہ ابن حجر مکی کی صواعق محرقہ[۱] اور تاریخ خمیس[۲] میں بھی موجود ہے۔

مسجد نبوی کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جس سے لوگوں کی آمد و رفت صحن مسجد میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت نے حکم دیا کہ سب دروازے چن دئے جائیں مگر علیؑ کے مکان کا دروازہ نہ چنا جائے اس حکم پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ "مجھے جو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا۔ میں نے اپنی مرضی سے نہ ان دروازوں کو بند کیا نہ اس کو کھلا رکھا[۳]۔

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی ان توجہات کو جو جناب علی کے ساتھ تھیں۔ اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے اور جناب رسالتمآب کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے، اور یہ وہ جذبات تھے جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا کیونکہ رسول اللہ کے الطاف جناب امیر پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے اور جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا حضرت علی اپنی خصوصیات اخلاق کی وجہ سے رسول اللہ کے دل میں گھر کرتے ہی جا رہے تھے۔

---

[۱] مطبوعہ مصر صفحہ ۷۵ [۲] جلد ۱ صفحہ ۴۹۸۔

[۳] خصائص نسائی صفحہ ۳۷۔ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۲۔

بھائی چارا اپنے ساتھ کیا۔ چنانچہ مورخ ابوالفدا[۱] لکھتا ہے :-

اخی رسول اللہ فاتخذ رسول اللہ علی ابن ابی طالب اخاوکان علیؑ یقول علی منبر الکوفۃ ایام خلافتہ انا عبد اللہ واخو رسول اللہ -	آنحضرت نے اپنے اصحاب میں مواخات قرار دی اور علی ابن ابی طالب کو اپنا بھائی قرار دیا۔ اور علی اپنے زمانہ خلافت میں کوفہ کے منبر پر کہا کرتے تھے کہ میں خدا کا بندہ اور رسول خدا کا بھائی ہوں -

ایک دوسرے موقعہ پر بھی رسول اللہ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنایا تھا اور علیؑ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ابن عبدالبر نے استیعاب[۲] میں لکھا ہے :-

اخی رسول اللہ بین المھاجرین ثم اخی بین المھاجرین والانصار وقال فی کل واحد منھما لعلی انت اخی فی الدنیا والاخرۃ -	رسول اللہؐ نے ایک بار مہاجرین کے درمیان مواخاۃ قائم کی اور دوسری بار مہاجرین وانصار کے درمیان اور ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ علیؑ دنیا وآخرت میں میرا بھائی ہے -

[۱] تاریخ ابوالفدا جلد ا صفحہ ۱۲۷

[۲] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ -

توحضرت فرمایا کہ:-

فقد امرنی ربی بذلک (اسکا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے۔)

جب عقد ہوچکا تو حضرت نے جناب فاطمہ سے فرمایا۔

اما ترضین یا فاطمۃ ان اللہ اختار من اہل الارض رجلین جعل احدھما اباک والاخر بعلک ؎۱

اے فاطمہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہل زمین میں دو شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک تمہارا باپ ہے، اور دوسرا شوہر۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی بلکہ انتخاب الٰہی اور فضیلت ذاتی پر تھی۔ مصالح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیاں لے لینا اور خود داماد بن جانا دوسری بات تھی، لیکن جب لڑکی دینے کا وقت آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی خواہش رد کر دی گئی اور حضرت علی کا انتخاب کیا گیا یہ واقعہ ایسا نہ تھا جس کا اثر زایل ہوجاتا، رہا اور عمر بھر رہا، چنانچہ حضرت عمر فرماتے تھے۔

لقد اعطی علی ثلث خصال لان تکون لی خصلۃ منھا احب الی من حمر النعم

علی کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی تو سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب

؎۱ ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲

سنہ ۲ ھ میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوئی جس کا نام جنگ بدر ہے[1]،
مسلمانوں کی تعداد کم تھی، ساز و سامان بھی موجود نہ تھا اور رسول اللہ کے
لئے میدان جنگ سے کچھ علیحدہ ایک عریش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ
کی حالت کا مشاہدہ فرماتے رہیں۔

حضرت ابوبکر نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا بلکہ وہ عریش
پر بیٹھے رہے[1] حضرت عثمان اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مدینہ ہی میں
رہ گئے تھے۔[2] میدان جنگ اُس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا جن میں نمایاں
حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں نے لیا۔ مثلاً حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب،
عبیدہ بن حارث اور حضرت علی۔ عبیدہ شہید ہوگئے اور حضرت علی کے ہاتھ
سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے[3]۔

اسی سال حضرت نے علی ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا اور
اپنی محبوب صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا عقد اُن سے کر دیا۔ تاریخوں کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے خواستگاری
کی مگر رسول اللہ نے کوئی جواب نہ دیا۔[4] لیکن جب حضرت علیؑ نے خواہش ظاہر کی

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۲۷ طبقات
ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۹ [2] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۶۔ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۸
طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶ [3] تاریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ [4] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۸۶
تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۰۰۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۹

اسوۃ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔ بہ تحقیق کہ مرا تو اقتدا است با یارانِ
مفرور چہ سروکار باشد۔ دریں اثنا جمعے از کفار متوجہ آنحضرت شدند۔
آنحضرتؐ فرمود "اے علیؑ، مرا ازیں جمع نگہدار، وحق خدمت بجا آر کہ وقت
نصرت ست۔ پس علیؑ متوجہ آں قوم شد۔ چناں قلع قمع نمود کہ جمعے
کثیر بہ دوزخ افتادند وباقی ماندگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ دراں
روز شانزدہ زخمہا برتنِ مبارک جناب امیر رسید ند"۔

دل تھرّاتا ہے، قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ
رکھ دوں، تاریخ کے صفحات سے ان حروف کو چھیل کر پھینک دوں۔ کس طرح
دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے فرار کیا لیکن حاکم کو کیا کروں، امام
فخر الدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزری، شیخ الاسلام سیوطی۔
ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں۔ جدھر دیکھئے اُس طرف سے "رو بہ ہزیمت
آوردند رسول اللہؐ را تنہا گذاشتند" کی آواز آ رہی ہے اور لطف یہ کہ ایک
ایک کا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تاریخ خمیس (جلد ا صفحہ ۴۸۵) میں ہے کہ حضرت ابو بکر فرماتے ہیں۔
لما صرف الناس یوم اُحد عن رسول اللّٰہ کنت اول من
جاء النبیؐ۔
(یعنی) جب لوگوں نے اُحد کے دن رسول اللہؐ سے روگردانی کی تو میں

فسئل ما هی قال تزویج ابنته سلہ	ہوتی۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں۔ کہا کہ ایک تو یہی ہے کہ رسولؐ کی صاحبزادی کا عقد اُن سے ہوا۔

سنہ ۳ھ میں اُحد کی جنگ ہوئی، یہ وہ سخت و فیصلہ کن جنگ تھی جسے قدرت کو مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اول اول حالات بہت اُمید افزا تھے، کیونکہ لشکر کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علی نے قتل کر کے دشمنوں کو شکست دیدی لیکن جب کفار بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے کے لئے پس و پیش سے بے خبر ہو گئے تو خالد ابن ولید نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ کر دیا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اُسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبانی سے سن لیجئے مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ:-

"مسلمانان روبہ ہزیمت آوردند و حضرت رسولؐ را تنہا گذاشتند، حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہاے اوشں متقاطر گشت، دراں حالت نظر کرد علی ابن ابی طالب را کہ در پہلوے مبارکش ایستادہ است فرمود کہ تو چرا بہ برادران خود لحق نگشتی یعنی فرار نہ کردی علی گفت اکفر بعد الایمان ان لی بک

سلہ صواعق محرقہ صفحہ ۷۸۔ تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ ۱۷۱۔

حضرت عثمان مقام اعوص کے حدود تک پہونچ گئے تھے اور جب یہاں سے تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول ؐ نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر کیا ہے[۱]
خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے :-

اذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم۔

وہ وقت جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تمھیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

یہ تھا وہ عبرت انگیز سماں اور یہ تھا وہ امتحان محبت و صداقت جس میں سوائے ایک ذات علیؑ کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔
رسول اللہ کو اس دل شکن طرز عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی کہ آپ نے خاتمۂ جنگ پر قتل ہو جانیوالوں کے متعلق فرمایا :- ھٰؤلاء اشھد علیھم یہ وہ ہیں جن کے ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں) -
حضرت ابو بکر نے کہا " یا رسول اللہ کیا ہم انکے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم اسلام نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپکے ساتھ جہاد نہیں کیا؟"
حضرت نے فرمایا :- بلی ولا ادری ما تحدثون بعدی " (ہاں،

[۱] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱ - استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۰۲ - تفسیر جامع البیان جلد ۴ صفحہ ۹۲ -

رسالت مآبؐ کے پاس سب سے پہلے واپس آیا۔

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۲ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے:۔

قال عمر لما کان یوم احد ھزمنا ففررت حتی صعدت

الجبل فلقد رأیتنی انزو کانی اروی "۔

یعنی حضرت عمر نے فرمایا کہ "جب اُحد کے دن لوگوں نے شکست کھائی

تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا وغیرہ وغیرہ"

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۳ صفحہ ۴۷) میں لکھتے ہیں۔

ومن المنھزمین عمر الا انہ لم یکن فی اوائل المنھزمین

ولم یبعد بل ثبت علی الجبل الی ان صعد النبی ومنھم ایضاً

عثمان انھزم مع رجلین یقال لھما سعد وعقبۃ انھزموا حتی

بلغوا موضعا بعیدا ثم رجعوا بعد ثلثۃ ایام فقال لھم النبی

لقد ذھبتم فیھا عریضۃ۔

(فراریوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں

نہ تھے اور بہت دور بھی نہ گئے تھے بلکہ پہاڑ پر چلے گئے تھے۔ فراریوں میں

سے حضرت عثمان بھی تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا اور یہ لوگ

بہت دور نکل گئے تھے اور جب تین دن کے بعد واپس آئے تو رسولؐ خدا

نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے)

ترک فرما دیا اور چند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرما لیا۔ یہ شرطیں ایسی تھیں جن سے رسول اللہؐ کی طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔ اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علیؑ تھے لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقعہ پر طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رواداری پہ عجب قسم کے غصہ و غم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے :-

قد کان اصحاب رسول الله خرجوا وهم لا يشكون في الفتح لرؤيا راها رسول الله فلما راوا ما رأوا من الصلح والرجوع وما تحمل عليه رسول الله في نفسه دخل الناس من ذلك امر عظيم حتى كادوا ان يهلكوا ؎۱

جو صحابہ رسول اللہ کے ساتھ آئے تھے انھیں یقین تھا کہ فتح ہو گی کیونکہ رسول اللہ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت نے صلح کر لی ہے اور سخت شرائط منظور کر کے واپس جا رہے ہیں تو اُن کے دلوں میں ایسی بری باتیں پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت عمر کا جو عالم تھا وہ خود اُن کی زبان سے سنئے :-

اتيت النبي فقلت الست

میں رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا کیا

؎۱ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۷۹

مگر کیا معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کروگے[1]۔

---

۵ سنہ ھ میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُحد کے واقعہ کا دھبا دامنوں پر موجود تھا اور اُسکے چھڑانے کا یہ موقع اچھا تھا لیکن عمر ابن عبدود کا سا بہادر پورے جوش و خروش سے مبارزطلبی کر رہا تھا، کس میں ہمت تھی کہ موت کے منھ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ :۔ طلب المبارزۃ والاصحاب ساکنون کانما علیٰ رؤوسہم الطیر لانھم کانوا یعلمون شجاعتہ (اُس نے مقابل طلب کیا اور صحابہ تمام خاموش تھے گویا کہ ان کے سروں پر طایر بیٹھا ہوا ہے، کیونکہ وہ سب اسکی شجاعت سے آگاہ تھے)

جناب امیر پہلی ہی آواز میں اٹھ کھڑے ہوے۔ مگر رسول اللہ نے انھیں روک دیا، لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمر ابن عبدود کی لن ترانیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہ نے جناب امیر ہی کو اجازت دی اور آخرکار انھیں کی تلوار نے اس مہم کو بھی سر کیا[2]۔

---

۶ سنہ ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ رسول اللہ بظاہر حج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین کے سدراہ ہونے سے آپنے حج کا ارادہ

---

[1] موطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۱۷۴ [2] تاریخ خمیس جلد ا صفحہ ۲۸۴

بغرزه فوالله انه على الحق قلت ولیس کان یحدثنا انا سنأتی البیت فنطوف به قال بلی افاخبرک انک تاتیه العام قلت لا فقال فانک اتیه فتطوف به[1]

فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ابوبکر کے پاس گیا اور اُن سے بھی وہی گفتگو کی جو رسول اللہ سے کی تھی۔

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابوبکر کے پاس اور پھر آنحضرت کے پاس جاکر سوال وجواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۲۴) میں ہے کہ حضرت عمر نے کہا:۔

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ (جب سے میں اسلام لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا، جیسا اُس دن ہوا)

یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے "کہ میں نے اس جسارت کے کفارہ میں بہت نمازیں پڑھیں اور روزے ادا کئے"۔

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہ سے اس قدر خفا ہو گئے تھے کہ جب صلح کے بعد رسول اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ "قوموا، فانحروا ثم احلقوا"۔ (اٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈواؤ) تو ان میں سے ایک بھی آمادہ نہ ہوا، یہاں تک کہ حضرت نے تین مرتبہ فرمایا اور جب اسکے بعد بھی کسی نے

[1] مواہب لدنیہ قسطلانی جلد ا صفحہ ۱۳۱۔

نبی اللہ قال بلی قلت السنا
علی الحق وعدونا علی الباطل
قال بلی، قلت فلم نعطی الدنیة
فی دیننا اذاً قال انی رسول اللہ
ولست اعصیه وهو ناصری
قلت اولیس کنت تحدثنا
انا سنأتی البیت فنطوف به
قال بلی افاخبرتک انا ناتیه
العام، قلت لا قال فانک
اتیه ومطوف به قال فاتیت
ابا بکر فقلت یا ابا بکر
الیس هذا نبی اللہ حقا قال
بلی قلت السنا علی الحق وعدونا
علی الباطل قال بلی قلت فلم نعطی
الدنیة فی دیننا اذاً قال
ایها الرجل انه رسول اللہ ولیس
یعصی ربه وهو ناصره فاستمسک

آپ رسولؐ خدا نہیں ہیں کہا کیوں نہیں
میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا
دشمن ناحق پر نہیں ہے، فرمایا ہاں
ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا پھر ہم اس
ذلت کو کیوں برداشت کریں، فرمایا
میں خدا کا رسولؐ ہوں اور خدا کے
حکم کے خلاف نہیں کرتا اور وہی میرا
مددگار ہے۔ میں نے کہا کیا آپ نے
ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم عنقریب خانۂ
کعبہ کی طرف جائینگے اور اس کا طواف
کریں گے۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں
لیکن کیا میں نے اسی سال کیلئے
کہا تھا میں نے کہا کہ یہ تو نہیں
کہا تھا، فرمایا پھر بس اب بھی
وہی کہتا ہوں کہ میں خانہ کعبہ
آؤں گا اور وہاں کا طواف
کروں گا۔

محمد ابن سعد کاتب واقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابوقتادہ نے سر نہیں منڈوایا تھا[۱]۔

—— ✧ ——

۷ھ میں خیبر کی مہم درپیش ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیر کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں اور آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیبر کے قلعوں میں سب سے زیادہ مضبوط قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پرچم اسلام لیکر تشریف لے گئے، لیکن ہر بار ناکام واپس آئے[۲]۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ "آنحضرت نے علم حضرت عمر کو دیا اور بہت سے لوگ آپکے ساتھ گئے لیکن خیبر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپکے اور آپ کے ساتھیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور سالتمآب کے پاس واپس آئے۔ اس حال میں کہ ساتھ والے ان پر بزدلی کا الزام لگاتے تھے اور آپ ساتھیوں پر[۳]۔

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہ نے فرمایا :-

اما واللہ لاعطین الرایۃ	کل میں علم اس شخص کو دوں گا جو
غداً رجلاً کراراً غیر فرار	بھاگنے والا نہیں ہے جو اللہ اور رسول کو

---

۱ طبقات ابن سعد جلد ۲ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۷۵ ۔ ۲ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۳ السیرۃ النبویہ عبدالملک ابن ہشام برحاشیہ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ ۳ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳

تعمیل حکم نہ کی تو حضرت کبیدہ خاطر ہو کر حضرت ام سلمہ کے خیمہ میں تشریف لیگئے[۱] جب رسول اللہ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوا چکے تو لوگوں نے بادل ناخواستہ خود بھی قربانیاں شروع کیں۔ "بادل ناخواستہ" کا حال ابن عباس کی روایت ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

حلق رجال یوم الحدیبیۃ و قصر اٰخرون فقال رسول اللّٰہ یرحم اللّٰہ المحلقین ، قالوا والمقصرین یا رسول اللّٰہ قال یرحم المحلقین قالوا والمقصرین یا رسول اللّٰہ قال یرحم المحلقین قالوا یا رسول اللّٰہ والمقصرین قال والمقصرین قالوا یا رسول اللّٰہ فلم ظاھرت الترحم للمحلقین دون المقصرین قال لانھم لم یشکوا۔

کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سر منڈوایا اور بعض نے بال ترشوائے رسول اللہ نے فرمایا سر منڈوانے والوں پر خدا رحمت کرے لوگوں نے کہا اور بال ترشوانے والوں پر، آپ نے پھر وہی کہا۔ آخر تیسری مرتبہ کہا کہ بال ترشوانے والوں پر بھی رحمت ہو، لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ان کو کیوں ترجیح دی، فرمایا کہ انھوں نے شک نہیں کیا تھا۔[۲]

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۰ - تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ -

[۲] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۱ - تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ -

کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار آپنے ان الفاظ میں فرمایا۔

اس خبر کے سننے کے بعد صحابہ پر کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے الفاظ میں سنئے:۔

فبات الناس یدوکون لیلتھم ایھم یعطاہ فلما اصبح الناس غدوا کلھم یرجوان یعطاہ۔	تمام رات لوگوں نے چہ میگوئیوں میں بسر کردی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یہ تمنا لئے ہوئے تھا کہ علم اسے ملیگا۔

طبقات ابن سعد کاتب واقدی میں ہے "حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے کبھی اس دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی مگر اس دن میں اونچا ہو ہو کر دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ علم مجھ کو دیا جائے گا"[۱]

طبری نے لکھا ہے کہ "جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر علم کے واسطے گردنیں اونچی کر کر کے دیکھنے لگے"[۲]

لیکن اس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا؟ حضرت نے علم کو لیکر جنبش دی اور فرمایا کون اس کو لیتا ہے، ایک صاحب آگے بڑھے اور کہا میں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ جاؤ آگے بڑھو، قسم اس خدا کی جس نے محمدؐ کے چہرہ کو عزت دی ہے میں یہ علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے۔ اے علیؑ اٹھو اور علم لو"[۳]

---

[۱] طبقات جلد ۲ صفحہ ۸۰۔ [۲] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳۔ [۳] الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۸۷

یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ یفتح اللہ علی یدیہ	دوست رکھتا ہے اور جسے اللہ و رسول دوست رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں سے فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں "کرارًا غیر فرار" کا ٹکڑا نہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۳ و طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۸۰) لیکن اگر اس ٹکڑے کو علیحدہ کر دیا جائے تو معنی تشنہ رہتے ہیں، کیونکہ صورت حال یہی تھی کہ برابر تین دن سے اصحاب کی سرکردگی میں مہمیں بھیجی جا رہی تھیں اور برابر وہ لوگ شکست کھا کر واپس آجاتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے یہی کہا ہوگا کہ کل میں اسکو علم دوں گا جو بھاگ کر واپس نہ آئے ورنہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، علاوہ اسکے اس فقرہ کو علیحدہ کر دینے سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ "کل میں علم اسکو دوں گا جو خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا و رسولؐ دوست رکھتے ہیں، گویا وہ لوگ جو اس سے قبل پرچم اسلام لیکر خیبر فتح کرنے گئے تھے وہ خدا و رسولؐ کے دوست نہ تھے اور اس صورت میں صحابہ کی اور زیادہ توہین ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال "کرار غیر فرار" کا ٹکڑا ہو یا نہ ہو، یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہؐ تین دن

لے تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۳ خصائص نسائی صفحہ ۱۱ - الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ سیرۃ نبویہ عبد الملک روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ - استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۷۳

کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک ہوئی جس میں رسول اللہ بغیر جنگ کئے ہوئے واپس آگئے تھے،
اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز وحیرت انگیز ہے اور قرآن مجید میں
اس کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

ویوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین -

اور حنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمھاری کثرت نے تمھیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ پہونچایا اور زمین تم پر تنگ ہوگئی اور تم نے جنگ میں پیٹھ دکھادی -

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کمینگاہ میں تھی، اس نے اچانک حملہ کر دیا اور
مسلمانوں کے قدم اُٹھ گئے - سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا۔[۱]
ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر
کا نام بھی نظر آتا ہے لیکن صحیح بخاری میں ابو قتادہ کی روایت یہ ہے -

"تمام مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا، ایک
مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ حضرت عمر بھی ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہوا
آپ نے فرمایا کیا بتاؤں خدا کی مرضی - پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ
رسالتماب کے پاس واپس گئے -"[۲]

---

[۱] الروض الانف سہیلی جلد ۲ صفحہ ۲۹ - مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۲ [۲] صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۳

چنانچہ آپ نے علم لیا، قلعہ فتح کیا اور کامران و بامراد واپس آئے۔

۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے، لیکن نبیؐ اور علی دو ہستیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ اصنام جو خانۂ کعبہ میں نصب کر دئے گئے تھے، رسالتمآب اور علی ابن ابیطالب ان بتوں کو توڑنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بت جو سب سے بڑا تھا اور خانۂ کعبہ کے اوپر نصب تھا اس کے توڑنے کے لئے رسول اللہ نے علی کو اپنے کاندھے پر بلند کیا اور آپ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ اسوقت رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

طوبیٰ لک تعمل للحق وطوبیٰ لی احمل للحق۔	(مبارک ہو تم کو تم حق کے لئے کام کر رہے ہو اور خوشا حال میرا کہ میں حق کیلئے تمہارا بار اٹھائے ہوئے ہوں) [1]

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انہی جزئی واقعات سے عمومی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور ایک مورخ انھیں واقعات سے صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں حنین کی جنگ ہوئی یہ رسول اللہ کی آخری لڑائی تھی

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۹۵۔

بعض مورخوں نے ابوسفیان کے بجائے حضرت عمر کا نام لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان تو یقیناً حضرت کے ساتھ تھے، حضرت عمر کے متعلق تھیک اختلاف ہے۔" سلہ

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ نے طائف کا محاصرہ کیا، کیونکہ مشرکین وہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہ نے جناب امیرؑ کو بلاکر بڑی دیر تک راز کی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور کہا: "لقد طال نجواہ مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں)۔ رسول اللہ نے سنا تو فرمایا۔ ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ" (میں نے علیؑ کو مشورے کے لئے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے)۔ اس روایت کو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔ سلہ

---

۹ ھ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی ہے اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے شدت کی لو چل رہی ہے اور رسالتمآب نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے تمام اصحاب کو حکم دیا ہے لیکن حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں قیام کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علیؑ

سلہ استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۹۸ سلہ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔

محدث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ :۔

"آنحضرت کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے، تین بنی ہاشم میں سے اور ایک اور جنکی تفصیل یہ ہے۔ علی و عباس آپکے آگے تھے، ابو سفیان لگام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا مگر یہ کہ وہ قتل ہو جاتا تھا۔ ؁۱

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت ام سلیم بنت ملحان نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، وہ رسالتمآب کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی۔ حضرت نے پکار کر فرمایا "ام سلیم" اس نے کہا "جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نثار، آخر آپ فرار ہونے والوں کو قتل کیوں نہیں کر ڈالتے"؟ حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ "یہ بھاگ جاتے ہیں، تو کیا ہوا خدا کافی ہے"!! ؁۲

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ :۔

"حنین کے دن آنحضرت کے پاس سے سب فرار کر گئے سوا عباس، عمر، علی اور ابو سفیان کے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرت ہی کے گھر کے رہ گئے تھے، ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی، علی، عباس، فضل ابن عباس، ابو سفیان، جعفر بن ابی سفیان، ربیعہ بن حارث اور اسامہ بن زید ہیں اور ان کے علاوہ آٹھویں ایمن ابن عبید۔

؁۱ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳، ؁۲ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔

مات ہر حالت میں رسولؐ اللہ کے جانشین تھے اور اگر ہارون سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہارون نبی تھے اور رسول اللہ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہوگیا لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علیؑ کے دوسرا نہ ہوتا۔

اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکہ معظمہ میں حج کے موقعہ پر ہونا تھا، اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو واپس بلاکر یہ خدمت حضرت علیؑ کے سپرد کی، دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علیؑ کو روانہ کیا کہ حضرت ابوبکر سے وہ آیات لیکر خود اس خدمت کو انجام دیں۔ بہرحال ان تمام روایات میں رسول اللہ کا یہ قول قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے کہ۔ علی منی وانا منہ ولا یؤدی عنی الا انا و علی۔ یعنی علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور اپنی ترجمانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علی۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں:۔ انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اھل بیتی (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یا میں خود اس کو پہنچا دوں یا ایسا شخص جو میرے اہلبیت میں داخل ہو)[1]

[1] خصائص نسائی صفحہ ۶۱-۶۴۔ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۲۸۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۴ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔ ریاض نضرہ صفحہ ۱۷۴۔

کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں:۔

اتخلفنی فی الصبیان والنساء (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جائیں گے؟)

حضرت جواب دیتے ہیں:۔ اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے[1])

اگر آخری جملہ "لا نبی بعدی" کا نہ ہوتا تو ہارون کی منزلت کو صرف وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیر کو اسی جانشینی اور خلافت کا درجہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ کے بعد حاصل ہوا۔

دنیا کو معلوم ہے کہ ہارون موسیٰ کے شریک کار، معاون اور وزیر و جانشین تھے اور اگر اُن کی زندگی موسیٰ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے اُن کے کسی کو نہ پہونچتا۔ بالکل اسی طرح جناب امیر کے لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات و

---

[1] صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۵۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۴۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۷۔ مواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۳۔ تاریخ الخلفا سیوطی ۱۶۷ و ۱۶۸۔

فی وجہہ فقال ما تریدون من علی ثلاثاً ان علیا منی وانا منہ وھو

ولی کل مومن بعدی (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آپ کے

چہرہ سے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علیؑ سے کیا چاہتے ہو، آخر کیا چاہتے ہو۔ علیؑ

مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے۔[1]

بریدہ کی روایت میں ہے :-

لما اتیت النبی دفعت الکتاب فقرأہ علیہ فرأیت الغضب

فی وجہہ فقال لا تقع فی علی فانہ منی وانا منہ وھو ولیکم بعدی -

(یعنی جب میں آیا اور حضرت کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے

آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا علیؑ کی برائی نہ کرو، وہ مجھ سے

ہے میں اس سے ہوں اور وہ تمہارا حاکم ہے میرے بعد)[2]

علامہ ابن حجر مکی شرح قصیدۂ ہمزیہ[3] میں لکھتے ہیں :-

ما صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو اللھم وال من والاہ وعاد

من عاداہ ان علیا منی وانا منہ وھو ولی کل مومن بعدی -

(صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا خداوندا دوست رکھ اُسے جو علیؑ کو دوست

رکھے اور دشمن رکھ اسکو جو علیؑ کو دشمن رکھے اور یہ کہ علیؑ مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور

وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

[1] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔ خصائص نسائی صفحہ ۲۳، ۱۵۔ [2] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۴۷۔
[3] مطبوعہ مصر صفحہ ۲۴۳۔

بہر حال حضرت ابوبکر روانہ ہو چکے تھے یا نہیں، وہ واپس بلائے گئے یا نہیں یہ مسلم ہے کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لئے حضرت نے جناب امیر کو منتخب کیا اور یہ کہکر کہ اس خدمت تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہلبیت میں داخل ہو۔

سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہ نے جناب امیر کو یمن کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ کیا اور اس شان سے کہ عقد لواءً وعممہ بیدہ وارخی طرفہا من قدامہ نحو ذراع ومن خلفہ قید شبر۔ (حضرت نے اُن کے لئے علم طیار کیا خود اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ کا ایک سرا آگے کی طرف قریب ایک ہاتھ کے سینہ پر ڈالدیا اور دوسرا سرا پشت کی طرف ایک بالشت لٹکا دیا۔[۱]

اس مہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلۂ ہمدان اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے۔ اس مہم پر پہلے خالد ابن ولید کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علی کے بھیجے جانے سے وہ معزول ہوئے اسلئے بعض حضرات کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی[۲] اور اس کا انتقام یوں لیا گیا کہ چند لوگ جناب علی کی یہ شکایت لیکر مدینہ پہونچے کہ آپ نے اموال خمس میں سے ایک کنیز پر بغیر اجازت رسولؐ تصرف کر لیا۔ اس کا جواب رسول اللہ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اب تک محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

عمران بن حصین کی روایت ہے کہ اقبل رسول اللہ والغضب یعرف

---

[۱] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ [۲] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۴۳۔

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہ حج سے فارغ ہوکر مدینہ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت چلتے چلتے غدیر خم تک پہونچتے ہیں، پورا قافلہ روک دیا جاتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ تقریر فرمائیں گے۔ ہزاروں آدمی خطبۂ نبوی سننے کیلئے مجتمع ہیں اور آپ منبر پر تشریف لیجا کر ایک مبسوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قرب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں، اپنی خدمات ہدایت کا ذکر فرماتے ہیں، لوگوں سے اصول اسلام وایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لئے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو طے فرمادیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بہ سند صحیح منقول ہے حسب ذیل ہے:-

ایھا الناس انی یوشک ان ادعیٰ فاجیب وانی مسؤل وانکم مسئولون فما ذا انتم قائلون (مسلمانو، عنقریب مجھے بلالیا جائے گا اور میں تم سے رخصت ہوجاؤں گا، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو اس لئے بتاؤ کہ جب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہوگے)

فقال لیس تشھدون ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ وان جنتہ حق وان نارہٗ حق وان البعث حق بعد الموت وان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا وان اللہ یبعث من فی

اسی سنہ ۱۰ھ کے آخر میں رسالتمآبؐ نے آخری حج کیا ہے جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، یہ جناب رسالتمآب کی زندگی کا آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی رحلت کو باقی ہیں۔

جناب امیر زکوٰۃ و خمس لینے یمن چلے گئے تھے جب رسول اللہ حج کے لئے روانہ ہوئے لیکن آپ وہاں سے واپس آ کر رسول اللہؐ سے مل گئے تھے۔ اس موقع پر بھی جناب امیر کی دیانت و امانت سے فوج والوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ یمن سے واپس ہوئے اور مکہ معظمہ کے قریب پہونچے تو آپ فوج سے علیحدہ ہو کر پہلے پہونچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو یمن سے آیا تھا لباس فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنوا دیا، جب فوج کا داخلہ ہونے لگا تو حضرت علی معائنہ کے لئے گئے اور یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور تمام لباس اُتروا کر اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات سبھی لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی اور رسول اللہ سے شکایت کی گئی تو آپ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا۔ لا تشکوا علیا فواللہ انہ لاخشن فی ذات اللہ من ان یشکی (یعنی علی کی شکایت نہ کرو، خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لئے اتنا بے لوث ہے کہ اُسکی شکایت کا موقعہ ہی نہیں ہے[1])

[1] سیرۃ ابن ہشام برحاشیۂ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۵۱۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۸۔ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۵۷۔ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

فرمایا اے لوگو، میں تمھارے آگے جاتا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس پہونچوگے
تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا
ایک ان میں سے کتاب خدا ہے جو ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا خدا سے متصل
اور دوسرا سرا تمھارے پاس ہے اس کو پکڑے رہو، گمراہ نہ ہو اور ادل بدل
نہ کرو، دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت۔ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ
دونوں فنا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہوں)

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵-۲۶) میں اس
روایت کو درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت
کیا الست اولی بکم من انفسکم (کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں
رکھتا) سب نے کہا بیشک، بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہ نے
حضرت علیؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ
وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق حیث دار (یعنی
جس کا میں مولیٰ ہوں علیؑ اس کا مولیٰ ہے خداوندا دوست رکھ اس کو جو اسے
دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے، مدد کر اس کی جو اس کی
مدد کرے، ساتھ چھوڑ اس کا جو اس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اس طرف گردش
دے جس طرف وہ گردش کرے)

القبور قالوا بلی نشهد بذلک قال اللهم اشهد - ثم قال یا ایها الناس
ان الله مولای وانا مولی المومنین وانا اولی بهم من انفسهم
فمن کنت مولاہ فهذا مولاہ یعنی علیاً اللهم وال من والاہ وعاد من
عاداہ (حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دوگے کہ سوائے اللہ
کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمدؐ خدا کا بندہ اور رسولؐ ہے اور جنت حق ہے،
جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے
والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مردوں کو زندہ کرے گا۔ سب نے کہا
ہاں، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، حضرت نے فرمایا، خداوندا گواہ رہنا۔
پھر فرمایا اے لوگو خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور
اُن کے نفسوں کا خود اُن سے زیادہ حقدار ہوں۔ اسکے بعد جسکا میں مولا
ہوں اُس کا یہ مولا ہے (علیؑ کی طرف اشارہ کیا) خداوندا دوست رکھ اسکو
جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اُسکو جو علیؑ کو دشمن رکھے) ثم قال
ایها الناس انی فرطکم وانتم واردون علی الحوض وانی اسئلکم
حین تردون علیّ عن الثقلین فانظرونی کیف تخلفونی فیهما
الثقل الاکبر کتاب الله سبب طرفه بید الله وطرفه بایدیکم
فاستمسکوا به لا تضلوا ولا تبدلوا وعترتی اهل بیتی فانه قد
نبأنی اللطیف الخبیر انهما لن ینقضیا حتی یردا علی الحوض (پھر حضرت نے

مل جائے جو تجلیات نبوی کے اوجھل ہو جانے کے بعد ہمارے لئے دلیل راہ بن کر
گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک
ہر موقع پر رسولؐ کے ساتھ مواسات وہمدردی میں پیش پیش رہنے والا، کسی
موقع پر قدم میں تزلزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں اطاعت
رسولؐ سے سرمو انحراف نہ کرنے والا کون تھا؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جناب
امیر کی اس اطاعت وجاں نثاری کی بنا پر رسول کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو
حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر
شکوہ وشکایت بھی کر گذرتے تھے۔

مسجد نبوی میں صحابہ کے مکانوں کے جو دروازے کھلتے تھے اُن کے
بند کر دئے جانے کا واقعہ طائف میں رسولؐ اور علیؑ کی رازدارانہ گفتگو کا حال
بریدہ کا واقعہ، اور حجۃ الوداع سے قبل یمن سے واپسی کا واقعہ آپنے ملاحظہ فرمایا
ہوگا اور رسالتمآبؐ کی طرف سے جناب امیرؑ کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب
ملتا تھا وہ بھی آپنے پڑھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نفسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات
اور زیادہ صحابہ کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ رسالتمآبؐ کو
احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا
ہو۔ اُحد میں صرف اتنی سنی افواہ پر کہ رسول اللہ قتل ہو گئے سب کے قدم میدان
سے اُٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبر نہ رہے تو اسلام کیسا اور لڑائی

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"یہ حدیث صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، اور ترمذی، نسائی، احمد بن حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کے طرق و سناد بہت زیادہ ہیں، چنانچہ ۱۶ صحابیوں نے اسکی روایت کی ہے اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابیوں نے اس کے سننے کی گواہی دی ہے اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن ہیں"[۱]

استیعاب ابن عبد البر[۲]۔ اسد الغابہ[۳] ابن اثیر جزری میں متعدد مقام پر یہ روایت مذکور ہے۔ حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :-

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر، جناب علی سے ملے اور کہا کہ مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولا"[۴]

اب رسولؐ کی زندگی صرف دو ماہ اور چند دن کی باقی رہ گئی ہے اور مسلمانوں کی شب یلدا جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا نزدیک ہے۔ آئیے واقعات کا ذرا جائزہ لے لیں، شاید رسولؐ اللہ کے بیانات سے کوئی شمع ہدایت ایسی

---

[۱] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔ [۲] مطبوعہ حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۳، ۲۷۳ [۳] جلد ۵ صفحہ ۲۰۵ جلد ۳ صفحہ ۲۷۴، ۳۰۷، ۳۲۱۔ [۴] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹

"آنحضرت نے فرمایا میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہونچوں گا، کچھ لوگ تم میں سے
میری طرف لائے جائینگے اور جب میں چاہوں گا کہ انھیں اپنے قریب
بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کر دئے جائیں گے۔ میں کہوں گا خدایا یہ تو
میرے اصحاب ہیں، ارشاد ہوگا تمھیں معلوم نہیں انھوں نے تمھارے بعد
کیا گل کھلائے"۔[1]

آنحضرت کو جن چیزوں کے متعلق یہ خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ الوداع
کے خطبہ میں ظاہر فرما دیا جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے۔ اس میں
آنحضرت نے اس تمہید کے ساتھ کہ انا فرطکم علی الحوض (میں حوض کوثر پر
تمھارا پیشرو ہوں) یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گرانقدر چھوڑے
جاتا ہوں، ایک کتاب خدا دوسرے اپنی عترت و اہلبیت، دیکھوں میرے
بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ اس طرح حضرت نے اس پہلی بعثت
کے موقع پر جو " انذر عشیرتک الاقربین" کا حکم نافذ ہونے پر لی گئی تھی،
علی کی وزارت، وصایت و خلافت کا اعلان فرما دیا تھا۔ پھر اسکے بعد مختلف
طرح سے علی کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے " انا مدینۃ العلم وعلی بابہا"
فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں تو صرف علی کے ذریعہ
سے "اقضاکم علی" کہکر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا۔ "علی منی" کہکر

[1] بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۳۶۔

کیسی۔ انس بن نضر نے لوگوں سے پوچھا "تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟"
جواب ملا کہ :۔ "رسولؐ تو ہی نہیں پھر ہم کیا کریں؟" انس نے کہا "رسول
نہیں تو نہ سہی تم ان کے دین پر تو قائم ہو اٹھو اور جہاد کرو" مگر بیٹھ رہنے والے
بیٹھے ہی رہے اور انس نے جان دیدی۔ قرآن مجید کی جو آتیں اس موقع سے
تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افئن
مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن
یضر الله شیئاً۔

(محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسولؐ جن کے پہلے بہت رسول گزر چکے تو کیا
وہ مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اسلام سے پلٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا
کرے گا تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا)

اس کے علاوہ رسالتمآبؐ نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار
کیا وہ بھی گوشگزار ہو چکے ہیں جب آپ نے شہدائے احد کے متعلق فرمایا کہ میں
ان کا گواہ ہوں تو حضرت ابوبکر نے کہا کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا
یہ سنکر رسول اللہ نے فرمایا "ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کرو"۔
دوسرے موقعوں پر حضرتؐ نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی
کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ :۔

علی الحوض فاسئلھما ما خلفت فیھما (علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا۔[۱]

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی حضرت نے اسی عالم میں ایک علم اسامہ بن زید کے لئے تیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لئے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر بھی اسامہ کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتمآب نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادر اوڑھے، سر پر رومال باندھے باہر آگئے اور منبر پر جا کر فرمایا:۔

"تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو بخدا وہ امارت کے لائق تھا اور یہ اس کا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے"[۲]

بیشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے حضرت علی کا نام نظر نہیں آتا شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تصریح کر دی ہے کہ:۔

---

[۱] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷۔ [۲] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ - مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۱۷۹ - تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

انتہائی یگانگت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر علی کی حکومت، ولایت و خلافت کا صریح اعلان فرمادیا، یہاں تک کہ صحابہ نے علی کو مبارکباد بھی دی، لیکن کیا رسول اللہ کو اطمینان ہوگیا تھا؟ ہرگز نہیں، واقعات تبلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہوکر مدینہ پہونچے، محرم کے مہینہ بھر آپ اچھے رہے، صفر میں بیمار پڑے اور اُس بیماری میں مبتلا ہوے جو آپ کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی۔ حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:۔

ایھا الناس یوشک ان اقبض قبضا سریعا فینطلق بی وقد قدمت الیکم القول معذرۃ الیکم الا انی مخلف فیکم کتاب ربی و عترتی اھل بیتی (اے لوگو بہت قریب ہے، وہ وقت کہ میں دنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں۔ میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہدیا ہے۔ اور حجت تمام کردی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہئیے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جارہا ہوں)

یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بلند کرکے فرمایا:۔

ھذا علی مع القرآن والقرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا

غش سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں "دوات و قلم منگواؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں نہ مبتلا ہو" مگر حضرت عمر نے انکار کردیا، فرمایا کہ "پیغمبر پر مرض کا غلبہ ہے اور ہم کو کتاب خدا کافی ہے"۔ صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن عباس سے ہے کہ:-

"ابن عباس کہتے تھے۔ ہائے پنجشنبہ کا دن۔ تم جانتے ہو کہ پنجشنبہ کے دن کیا ہوا۔ رسالتماب پر مرض کی شدت ہوئی۔ حضرت نے فرمایا لاؤ میں تمہیں ایک نوشتہ تحریر کردوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو، لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ پھر آپ سے دریافت کریں حضرت نے فرمایا "جاؤ چھوڑ دو مجھ کو، میں جس حال میں ہوں اسی حال میں رہنے دو"[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ:-

"جب رسالتمآب کا آخر وقت تھا اُس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود تھے حضرت نے فرمایا آؤ میں تمہیں ایک نوشتہ تحریر کردوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرت پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن تو موجود ہی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے

---

[1] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۸

"حکم عالی خیاں صادر شد کہ از اعیان مہاجر و انصار مثلاً ابوبکر صدیق،
و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابو عبیدہ بن الجراح
و غیرہم الا علی مرتضیٰ را کہ ہمراہ نکردد در ان لشکر ہمراہ اسامہ باشند۔"
واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا
وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اسکے لئے طیاریاں کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر
حضرت کا خاص طور سے لشکر اسامہ کی روانگی کا حکم دینا اسی لئے تھا کہ وہ ان تمام
لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا منشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد امور خلق کی ذمہ داری
ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقت آخر میں ان لوگوں
کو لشکر اسامہ کے ساتھ جانے کی تاکید نہ فرماتے۔ حضرت کو اس امر میں اتنا اہتمام
تھا کہ شدت مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر
فوراً روانہ ہو جائے۔ لوگ رسول خدا کے اس منشاء کو سمجھتے تھے اور اسی لئے
تعمیل حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا اور
گیا اس وقت جب رسول اللہ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو
پہونچ گیا۔

اب رسالتمآب کا مرض انتہائی شدت تک پہونچ گیا ہے، مگر اب بھی اگر کوئی
خیال آپ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ ہے تو وہی ایک۔ ایک بار

علیہ اخرجہ الرازی -

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ جب حضرت کا بالکل وقت آخر تھا تو آپ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو، کوئی جا کر حضرت ابوبکر کو بلا لایا آپ نے تکیہ سے سر اُٹھا کر دیکھا اور پھر تکیہ پر سر رکھدیا، دوبارہ فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو۔ اب جا کر حضرت عمر کو بلا لائے آپ نے ان کو بھی دیکھ کر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ پھر آپ نے یہی فرمایا کسی نے علی کو بلا لیا۔ جب آپ نے علی کو دیکھا تو انھیں اپنی چادر میں لے لیا جس کو آپ اوڑھے ہوئے تھے اور برابر اسی طرح لئے رہے یہاں تک کہ حضرت کی روح مبارک نے جسم سے پرواز کی تو آپ کا ہاتھ علی کے اوپر تھا[۱] -

---

[۱] ریاض نضرہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ -

اُن میں اختلاف شروع ہوگیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے قلم دوات دیدو، کچھ اسکے مخالف تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ میرے پاس سے"۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے، لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہوجاتا ہے اور اسمیں صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمر تھے (ملاحظہ ہو بخاری باب قول المریض قوموا عنی[1])

—— ⁘ ——

رسالتمآب کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ پہونچا ہو کم ہے، چنانچہ اسی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپنے برہم ہوکر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے، اس داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہے اور یہ کسی اور کے منھ کی بات نہیں ہے بلکہ خود جناب عائشہ کا بیان ہے ۔

قالت قال رسول اللہ لما حضرتہ الوفاۃ ادعوا الی حبیبی فدعوا لہ ابا بکر فنظر الیہ ثم وضع راسہ، ثم قال ادعوا الی حبیبی فدعوا لہ عمر فنظر الیہ ثم وضع راسہ ثم قال ادعوا الی حبیبی فدعوا لہ علیا فلما راٰہ ادخلہ معہ فی الثوب الذی کان علیہ فلم یزل یحتضنہ حتی قبض ویدہ

[1] بخاری جلد ۴ صفحہ ۵ -

بہر حال جو کچھ بھی ہو انکی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس مبحث پر قلم اٹھاتے وقت موصوف نے
واقعات پر "فلسفہ تاریخ" کی روشنی میں نفسیاتی اعتبار سے کوئی نظر نہیں
ڈالی۔ نیز "فلسفہ نبوت" اور عام اخلاق انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی
اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش
کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔
افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کے ساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر
جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے
اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل واستنتاج کے ساتھ
ساتھ دنیا کے علمی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہر حال میں مسلمان
ہوں اور پھر اہل سنت اسلئے میں حتی الوسع کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی
تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا
پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔ "بزمی"
فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ ریاضی کے دقیق سے دقیق
نظریے حل کئے جا سکتے ہیں۔ نظام بطلیموسی کی جگہ نظام فیثا غورث لے سکتا ہے
نیوٹن کے نظریہ کشش کو انیشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے لیکن اگر بلند نظری اور
بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسائل

مسئلہ خلافت و امامت(۱)

"نگار" مارچ ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں "خلافت و امامت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہلِ قلم جناب "ہرنام" کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر یہ بحث میں غیر جانبداری کے ساتھ خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے "شیعیت" کے ساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گو بظاہر اُن کا اسم گرامی "ہرنام" ہے لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علیؓ کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر اُن کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں اُن کا "دل تھراتا ہے۔ قلم لرزتا ہے جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا۔" (صفحہ ۴۴)

(۱) نگار جولائی ۱۹۳۵ء

سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائے گی جن میں خالص سیاسی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد۔ حد زنا و سرقہ وغیرہ وغیرہ۔
الیوم اکملت لکم دینکم وا تممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا۔ (سورہ المائدہ۔ آیتہ ۳) کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریم کے معاشرتی اور اخلاقی صلاح کے پروگرام میں حکومت وسیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لئے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریم کی سیاسی حیثیت کا مسلم ہو جانا آپکے "درس" کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی صلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ رکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی صلاح اُسوقت تک ناممکن ہے جبتک ملکی سیاست کے ارباب حل وعقد اس میں دستگیر ومعاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ "میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہو"

طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے کے باوجود
خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریمؐ کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی
مؤدب کی حیثیت ہے لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہیں لئے جا سکتے کہ آپ کی اس
حیثیت سے "سیاست ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر
اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے
لیکن رسول عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اس وقت تک
حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک حکومت و سیاست کی اعانت
اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی
بنا پر کہتے ہوں۔ بلکہ یورپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی
تائید کرتے ہیں۔ اگر گولڈزیہر۔ فان کریمر۔ لوئنڈی۔ دی ساسی۔ کاترمیر۔
نکلسن اور براؤن جیسے مسلمہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے
تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ محمدؐ کی تعلیمات میں "چرچ" اور
"اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجیے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ نبی کریمؐ سیاست
بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی اُن

وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر ان کی حیثیت ایک "بڑے پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آجکل
کے مجتہد کی طرح اُنھوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا؟
یا زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنی برائت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے؟
بہر حال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور
سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریم
کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا
مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب
ترین فرماں روا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابہ کرام کے گروہ
میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا؟ اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے
کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے۔ اسے اس عہدہ کا اہل
سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی
شک ہونا ہی نہ چاہیئے۔ جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی
پاکیزگی سیاسی بلند نظری۔ اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے۔
لیکن یہاں بہو نکتہ ہم کو جس پر خار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ
یہ ہے۔ "کیا نبی کریم حضرت علی کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے"؟
حضرت علی ایک متقی زاہد اور خدا کا صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے

حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسکو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے۔ جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اسوقت تک نہیں ہو سکتا جبتک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریم کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علی کو نبی کریم کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے۔ اسکا کیا جواب دے گی کہ خود حضرت علی نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقا کے لئے جنگ جمل میں صف آرائی کی۔ طلحہ و زبیر کو قتل کرایا۔ معاویہ کے مقابلہ کے لئے میدان صفین میں پڑاو ڈالا۔ اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا۔[1] میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علی کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو۔ الکامل للمبرد مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔ فان کریمر وغیرہ مستشرقین یورپ نے اس کتاب کو حضرت علی کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ دیا ہے۔

علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور بالواسطہ طور پر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسولؐ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابوبکر اور عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسولؐ پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشقِ رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لختِ جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اسکے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں ــــ غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہیئے۔ لیکن اسکے باوجود بھی اگر وہ رسولؐ کی بارگاہ میں صرف اس لئے نظروں سے گرے ہوئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں رسولؐ کا چچیرا بھائی اور اس کا داماد ہے ــــ تو پھر اسکا نام "متعصبانہ عزیز پرستی" اور نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپکے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی
ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات
سے متاثر ہو کر آپکے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصافی الفاظ
کی منطقی اور لغوی تحلیل کر کے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریم آپ کو اپنا جانشین
بنانے کے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی
بنیادی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غور تو کیجئے، جس شخص کو محمدؐ عربی کے الہامی نبی
ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی
طور پر حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس
الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبر اپنے عزم و
ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے۔ اُن کے تنخاؤں کو چکنا چور
کر سکتا ہے۔ شراب کے قرابوں کو توڑ کر پھنکوا سکتا ہے۔ اہل عرب کے نسبی فخر
کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے۔ کیا اسکی اس اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے
بھی اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ محض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین
کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ
مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیادارانہ مصلحتوں کے تحت
ایک عظیم المرتبت نبی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت
کے اظہار سے جان چراتا رہے؟

صرف دوسرا سوال باقی رہجاتا ہے یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے اس سلسلہ میں "مؤیدین امامت" "انا مدینۃ العلم وعلیٌ بابھا" کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جاوے:-

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اسکے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے اُن کا کرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "اس کی تعبیر"؟ آپؐ نے فرمایا۔ "عمر کی دینداری"۔ [1]

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا۔ اور باقی حضرت عمر کو دیدیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتلائی"۔ [2]

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن اُن پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الایمان [2] صحیح بخاری۔ کتاب العلم۔

اب ہم بحث کے اس رخ کی طرف آتے ہیں۔ جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ "حضرت علی تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے"۔ اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لئے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے تائید کی کر سکتے ہیں:۔

"حضرت علی میں حکمراں ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"[1]

اسکے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علی کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہئے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے اسلئے "مؤیدین امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کئے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ نبی کریم کے اقوال سے حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے اسلئے اب ہمارے سامنے

(۱) لٹریری ہسٹری آف عرب مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱

آخرت میں میری ماں ہیں" یا "عبداللہ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں"۔
حضرت ابوبکر کی جاں نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی
مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے :-
ثانی اثنین اذھما فی الغار یقول لصاحبہ لا تحزن
ان اللہ معنا"
یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر
کج بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی
اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدا بخش لائبریری پٹنہ" میں قرآن کا ایک
قلمی نسخہ ہے۔ جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا
نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام "نورین"
ہے اور دوسری کا نام "ولایت"۔ نیز ۳۴ آیات بھی حسب ضرورت بڑھا دی
گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف"
نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسائل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے اور اس اضافہ کے
متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہل تشیع کی صریح حمایت
میں تھے اس لئے اہل سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا۔ (نعوذ باللہ)
بہر حال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکر کی مذمت میں
تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے :-

یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر ہیں۔[1]

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ "کنت انا و ابوبکر و عمر" و "فعلت انا و ابوبکر و عمر" و "انطلقت انا و ابوبکر و عمر"۔[2]

ممکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لئے زیادہ قابل وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے لیکن دوسری حدیث کے رواۃ کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابل تذکرہ ہے جس میں رسول کریم سے ایک عورت نے پوچھا ہے "آپکے بعد میں مسائل کس سے پوچھوں گی" آپنے فرمایا "ابوبکر سے"۔

ایک موقعہ پر رسول کریم نے حضرت علی کے متعلق یہ فرمایا تھا "علی دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے" اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کریم اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علی واقعتہً آپکے بھائی تھے۔ اور اس لئے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کہتے "آمنہ دنیا اور

[1] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی [2] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی

اسکے علاوہ دوسرا سبب جس کی بنا پر اُن کی یہ مسابقت فی الاسلام مقابلتہً
اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے ۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریم کے چچیرے
بھائی تھے ۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ اُن کی اس " مسابقت ایمانی " میں
قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے " وصول الی الحق " کا وہ بے لوث جذبہ کارفرما
نہیں ہو سکتا جو ابوبکر و عمر جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جا سکتا ہے ۔
علاوہ ازیں رسول ؐ کے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسول ؐ کا
پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا ۔ پھر اس کو حسن اتفاق کی
مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں ۔ فخر
البتہ یہ ہے کہ رسول ؐ کا پیغام سنتے ہی فوراً " آمنا " کہدیا جائے ۔ حقیقتاً حضرت
علیؓ کو یہ فخر پہنچتا ہے لیکن اس میں حضرت ابوبکر بھی برابر کے شریک ہیں ۔
ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے
اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا :۔

" ان ھذا اخی ووصیّی وخلیفتی فیکم "

لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں
ہو سکتا ۔ اسوقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار " لیڈر " سے
زیادہ نہ تھی ۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ
مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت علی کی حوصلہ

"یقول لصاحبہ ، ویحاث لا تحزن ان اللہ معنا"

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے ۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علی کی امامت کو ثابت کرنے کے لئے اُن کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے ۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے ۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے ۔

بہر حال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دیدیا جائے ۔ اس لئے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی ۔ لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتلائی گئی ہے وہ سولہ برس ہے ۔ اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل وشعور کا آغاز ہوتا ہے اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے ۔ اور بہت جلدی باتوں پہ یقین کر لیتا ہے اور اس لئے اگرچہ حضرت علی کی مذہبی رفعت شان اور جلالت ومرتبت میں کسی مسلمان کو شبہہ نہیں ہو سکتا لیکن مقابلۃً اُن کے اسلام کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابل اہمیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لئے انھوں نے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔ اس میں اُن کو ناکامی ہوئی۔ پھر خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔

ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا۔ تو اہل ایران کی غیرت قومی اور حمیت ملی کے لئے یہ چیز سخت ناقابل برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں[1]۔ گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ

[1] اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے جو بتلاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پرشور" نظر آتا ہے:

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید ہست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اُس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علی کی الوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسن کی اُلوہی امامت کو بھی مانتا ہے۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسن کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے لیا۔ اُن کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائیگا؟ [1]

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علی کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لئے جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا۔ جن کو اسوقت کامیاب بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا۔ اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا ہے۔

عربوں کی فطری خاندانی عصبیت کے ماتحت نبی کریم کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل للمبرد جلد ۳ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۲۔

المختصر ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا کہا جاسکے، اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط

سید ابو سعید بزمی بھوپالی۔ بی اے

اگرچہ چالیسویں صدی ہجری میں حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ کے بیرحم ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا تھا تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گذرنے کے بعد آج دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کیلئے بھی قابلِ رشک ہوتا۔ لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا۔ انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا بہت اچھا موقعہ دیکھا۔ کہ حضرت علی کی الہامی نبوت کی آڑ میں خاندان اموی کے خلاف پروپگینڈا شروع کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹۔ جون ۷۴۷ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشہ سے ابومسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا۔ اور گو عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا۔ چنانچہ خاندان صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو بنوک شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبداللہ ابن میمون القداح کی اس عظیم الشان تاریخی سازش کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی[1]

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسلم تھیالوجی مصنفہ میکڈانلڈ۔

دبنے کی کوشش کی گئی ہوتی ۔

"نگار" مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شایع ہوا - اس کے پورے چار مہینہ
کے بعد جولائی کے پرچہ میں میرے نادیدہ کرمفرما سید ابو سعید بزمی صاحب
بھوپالی بی اے کا مضمون شایع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدیر نگار کا یہ
نوٹ قابل لحاظ تھا کہ "ہرنام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے
ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شایع
کرتے ہیں - اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شایع کریں گے -
اس کے بعد قدرتاً مجھے انتظار پیدا ہونا چاہیے تھا اور یقیناً جواب الجواب
کے لئے مجھے اُسوقت تک قلم اُٹھانے کا حق نہیں تھا جب تک میرے
مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہ ہو -
لیکن افسوس ہے کہ اُس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل
اس بحث سے خالی ہیں - جناب نیاز کی وسیع الخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے
کہ اگر دوسرے مضامین اُن کے معیار ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شایع
کرتے، بہرحال اب میرا محور نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لئے
کہ نگار کے بساط بحث پر سوائے اُنکے کوئی نہیں آیا ہے -

---

(۴)

مسئلہ خلافت(۱)

(مہر نام کے قلم سے)

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سلجھے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شائع ہوا تھا مضمون نگار صاحب میری "شخصیت" کے متعلق بھی زورِ قلم ضرور صرف کریں گے۔

کوئی کچھ سمجھے۔ مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ اور کہے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعہ کرتے شیعی مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے اور میں نے محض ذوقِ تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اُس کے بارے میں چھان بین کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کرلے کہ میں شیعہ ہوں (۲) اس کا اصل حقیقتِ مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کرکے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوقِ تحقیق اتنا گم ہو گیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کو دیکھنے کی اتنی عادی ہو گئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہو جانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے اُن کے جواب

(۱) نگار، نومبر ۳۵ء

صاحبانِ حقوق کے حق پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اُس پر کوئی ناجائز قبضہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفۂ احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ "آنحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے۔ جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنچ میں ڈالنے والے ہیں تو سنیئے۔

"دنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا۔ آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرنا اور حدود مملکت کا وسیع کرنا کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا۔ مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زیادتی توسیع حدود سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں نہ حق اور ناحق کا سوال ہے۔ نہ عدل و انصاف کی شرط ہے۔ نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

پہلی بات جسے محل بحث قرار دیا گیا ہے اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور سیاست ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔ سجانے میری کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلام کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علیحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار دینا چاہتا ہوں"۔

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ "اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی"۔

اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذر تحریر کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانہ شہادت میں الگ بلائے گئے جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد حد زنا و سرقہ وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کر دی گئیں اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں یعنی امامت کے حقوق کو صرف تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں ورنہ انھیں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ سے شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ انھوں نے

انھیں دنیا کے اس عام اصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن اُنکا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا۔

اُن کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں توسیع ملک۔ فتوحات۔ جاہ و حشمت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملکی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہو گئی اور وہ باقی نہیں رہی۔

یعنی پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی و قیصری سنتیں قائم ہو گئیں اور اس لئے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حضرت علی کے مختصر دور حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناکامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جو آنحضرت کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا اور اس لئے آپ اجتماعات ملکی و تمدنی میں کلیتہً اُسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبرؐ کا اصلی منشا تھا مگر اُمت اسلامیہ کے عام افراد کی پچیس برس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں

اس کا معیار تفوق صرف جہانگیری و جہاں بانی ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام و قانون کو میں "سیاست آسمانی" کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی۔ لوازم تمدنی۔ انتظامات ملی سب بلندی اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں وہاں اصل مقصد توسیع حدود مملکت کا نہ ہو بلکہ قوم بنائی جا رہی ہو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ۔ بے شک قوم کی تشکیل بغیر "قوانین اجتماعی" کے ہوتی ہی نہیں اور انھیں قوانین اجتماعی کا نام "نظام سیاسی" ہے لیکن یہ "سیاست" اس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیت اخلاقی سے علیحدہ ہو ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھئے یا بارگاہ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتقادی یا جو کچھ کہ ان کے خیال میں حضرت پیغمبر جس طرح اپنے زمانہ کے بہترین مصلح انفرادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اس کا اصلی طرۂ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے۔

جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہلسنت حضرت عثمان حصہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر حضرت علیؑ ہی کے متعلق آنحضرتؐ نے اُن اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اُس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اسکے علاوہ کیا پیغمبر اسلام صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چچیرے بھائی اور داماد ہونے کی وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں حالانکہ دوسرے صحابہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔

اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ قرابت وعزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا رہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادیوں کو اُس کے حبالہ ازدواج میں دیدیتے ہیں (بقول نزمی صاحب) اُس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ تیلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اسکے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہیئے لیکن اس کے باوجود بھی جب موقع پڑتا ہے تو رسول علی کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لئے ویسے اوصاف اور اُتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے

وہ خصلتیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرم کے بعد بلا فاصلہ تسلیم کر لی جاتی اور آپ برسر اقتدار ہو جاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکیہ" و "سیاست نبویہ" میں کتنا تفرقہ ہے۔

یہ کہنا کہ حضرت علیؑ ایک متقی زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علی کی شمار کرائی گئی ہیں ان میں سے "متقی" اور "زاہد" اور "فداکار" اور "صحابی" اور "رفیق و معاون" کی صفتوں میں تو جمہور اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علی کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دیئے ہوئے ہے۔ پھر اب رہ کیا جاتا ہے چچیرا بھائی اور داماد ہونا۔ چچیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور

اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں۔

یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ۔ اس کے حل کے لئے مستشرقین یورپ کے دامن
سے تمسک میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی
روح کو سمجھ گئے ہیں؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبر کی ذات پر جو بہت اعتراضات
ان کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں صحیح تسلیم کیا جائے؟
سب سے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل شامل ہی نہیں
بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جناب ہزمی صاحب نے
امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ انا مدینۃ العلم وعلی بابہا اس کے مقابلہ پر آپ نے
حدیثیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے
سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا یہی انداز ہے
تو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ
ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ و جلد بتا دے
دیکھئے آپ کی کتابوں سے۔ آپ اس کے جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری
بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں۔ (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب
میں رسالہ "فاران" بجنور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری
کے علاوہ جتنی تفسیر حدیث علم رجال و سیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد

صرف اس لئے کہ یہ ان کے مقابلہ میں رسول کا بھائی اور داماد ہے۔ تو پھر اس کا
نام "متعصبانہ عزیز پرستی" ( ) نہیں تو اور
کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بے رحمانہ جانبداری" اور غیر منصفانہ
پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر شاگرد
جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔
میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔
میں کہتا ہوں کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علی کو
اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے
ساتھ کیا اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہیئے کہ آپ کا یہ فعل کسی عزیز داری کے
لحاظ اور بیجا پاسداری پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات
و خصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف و توصیف پر
آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قائم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔
اگر ایمان بالغیب جو اسلام کا جزو اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس
کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا سمجھنا ضروری ہے۔
یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب و غریب ہے کہ "اگر فی الواقع نبی کریم
حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس الاشہاد
اس کا اعلان کیوں نہیں کیا۔

"نوجوانی میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے" مگر انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور قوت خیال وساوس واوہام زیادہ پیدا کرتی ہے اسلئے ان تمام شکوک واوہام کے مقابلہ میں کسی حقیقت پر سر تسلیم خم کردینا کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ "چچیرے بھائی" اور قریب کے عزیز دوسرے بھی موجود تھے لیکن انھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہرحال سبقت ایک شرف ہے جو "السابقون السابقون اولئك المقربون" میں معیار تقرب قرار دیا گیا ہے۔ اس میں عزیز اور غیر عزیز۔ نوعمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ لیکن ہمارا مضمون دیکھ لیا جائے ہم نے اس کو کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے مضمون کے سلسلۂ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھکر اس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا!

کہا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے متعلق کہا تھا۔ "ان ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم" لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریمؐ کی پوزیشن ایک بے یار ومددگار" لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے

کردینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روائتیں مل ہی جاتی ہیں۔

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ اُن حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر اُن روائتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش کی لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اُس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟ "ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے اب آپ بغیر اُس پر کچھ نقد و تبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہدیں کہ "یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے" تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس طرح وقعت دی جائے؟

"سبقت اسلام" کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کیلئے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "ژولیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

سامنے حضرت علی کی خلافت کی بحث مین امام حسن کی امامت کا سوال پیدا ہی
نہین ہوتا ۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علی کی امامت کو تسلیم
کرے اور حضرت حسن کو تسلیم نہ کرے ۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسن
کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اُس کو شیعہ فریق فرقۂ خوارج کی اختراع
قرار دیتا ہے ۔ لہذا قابل تسلیم نہیں ہے ۔ پھر اسکے مقابلہ مین وہ منفقہ
تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہین کہ حضرت ابوبکر نے فجاءہ سلمی کو زندہ آگ
مین ڈال کر جلوا دیا ۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت
کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہین ۔

———— ⁘ ————

مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے ۔ میرا گذشتہ مضمون جو حقیقت
ابھی تک بالکل کورا ہے اور اُس تک دست نقد و اعتراض نہین پہونچا ہے
شیعیت کے ایرانی سایۂ تربیت مین ایجاد ہونے کے فرضی افسانے
بنانے سے حقیقت بدل نہین جائے گی ۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزون سے
بالکل علیحدہ ہے ۔

———— ⁘ ————

سب سے آخر مین مجھے اس فقرہ پر ریمارک کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا
مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا کہا جا سکے اور نہ "شیعیت"

زیادہ نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اُن کو اُس حالت مین نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے"۔

یہ الفاظ جنھین پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے دیکھ رہا ہون۔ کیا نبی کریم مسلمانون کی نگاہ مین مکّار لوگون کی طرح دنیادار۔ حیلہ ساز۔ خودغرض۔ اور ابن الوقت تھے؟ اُنھون نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے کہدیا کہ یہ میرے وصی ہین۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین ہین۔ اس طرح کام نکال لیا اور ان جملون کے معنی کچھ بھی نہین تھے؟ مین تو سمجھ سکتا ہون کہ حضرت محمد مصطفےٰ کی سچائی۔ امانت اور دیانت اور بے لوث اخلاق قولی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہین کر سکتا۔
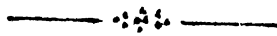
اس جگہ حضرت علی کی امامت و خلافت کے تذکرہ مین بالکل بے جوڑ طریقے سے یہ کہدیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علی کو صحیح تسلیم کرے گا تو حضرت حسن کو بھی مانیگا لیکن آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اُس کو دیکھکر اُن کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم رہتا ہے۔ اس کے جواب مین پہلے تو مین یہ کہون گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے

(۴)

مسئلہ خلافت و امامت

(میرے نقطۂ نظر سے)

(از قلم جناب نیاز فتحپوری مدیر نگار)

نگار میں اس مسئلہ کی ابتدا ایک صاحب ، ہرنام کے مضمون سے ہوئی جنھوں نے شیعی نقطۂ نگاہ اور استنادات اہل تسنن سے ، وصایت و ولایت جناب امیر کو ثابت کیا تھا ، اس کے جواب میں جو مضامین اہل تسنن کی طرف سے موصول ہوئے اُن میں اکثر تشنہ و نامکمل تھے ۔ صرف جناب ابو سعید بزمی ایم ۔ اے کا ایک مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا ، درانحالیکہ وہ بھی کوئی قاطع جواب ہرنام کے مضمون کا نہ تھا ۔ اس کے بعد ہرنام صاحب کا پھر دوسرا مقالہ نومبر کے نگار میں جناب بزمی کے جواب میں شایع ہوا ۔ اور اسی کے ساتھ میں نے وعدہ کیا کہ اب بغیر کسی مزید انتظار کے اپنی رائے اس مسئلہ میں پیش کروں گا ۔ دسمبر میں مجھے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا موقعہ نہ ملا ، جنوری میں اس بحث کی گنجایش نہ تھی اس لئے اب فروری کی اشاعت

اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہین اسکو تو مسلمان ہی
سمجھ سکتے ہین۔ میرے خیال مین تو اس بحث کی اہمیت مسلمانون کی عملی
اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و
تعلیمات مذہبی مین کن پیشوایان دین کو اپنا راہنما قرار دین اور اُن کے
تعلیمات پر عمل کرین۔ اسی طرح یہ فقرہ کہ "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"
اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہین لیکن مین سمجھتا ہون کہ مسلمانون مین
افتراق اسی قسم کی تعبیری بے اعتدالیون کی وجہ سے ہے۔ آپ کہئے گا
"شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہین"۔ شیعہ کہین گے "سنیت اسلام کا
مذہبی فرقہ نہین"۔ نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہین۔ یہ کبھی ہو جائے
کہ سنی سب شیعہ بن جائین یا شیعہ سب سنی بن جائین غیر ممکن لیکن اتحاد و اتفاق
کی صورت یہ ہے کہ آپ اُن کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجئے اور اُن کا احترام
کیجئے۔ وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کرین اور احترام کرین چلئے اس طرح
شیرازہ مجتمع رہیگا اور ملت اسلامیہ کا نظام درہم و برہم نہ ہوگا۔ خدا
جانتا ہے کہ مسلمانون کا خیر خواہ ہون اس لئے اتنا لکھ بھی دیا نہین تو
مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

"بے نام"

فضیلت نہ دوسرے کی فضیلت سے انکار کا مترادف ہوا کرتی ہے اور نہ
اس سے کسی دوسرے کا حق محو ہو سکتا ہے۔

غالباً مناسب ہوگا کہ پہلے ایک اجمالی تبصرہ اس وقت تک کے مضامین
پر کر دیا جائے تاکہ جس حد تک روایتی استناداات کا تعلق ہے یہ بحث
ابتدا ہی میں ختم ہو جائے۔

سب سے پہلی خصوصیت جناب امیر کی ہرنام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ
آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ ہرچند سابقیت اسلام کوئی ایسا مسئلہ نہیں
جو خلافت و امامت پر موثر ہو سکے، لیکن چونکہ رسالۂ فاران میں کسی صاحب
(مولوی فاروق) نے ہرنام کے مضمون کا جواب لکھتے ہوئے اس کی بھی تردید
کی تھی اس لئے نامناسب نہوگا اگر اس مسئلہ پر بھی محاکمہ کیا جائے۔

مولوی فاروق صاحب نے بروایت بخاری ثابت کیا ہے کہ حضرت علی کا
نمبر اسلام لانے والوں میں چوتھا یا نواں تھا لیکن بخاری کی جن دو روایتوں
سے استناد کیا جاتا ہے ان دونوں کے ایک راوی اسماعیل بن مجاہد ہیں
جو نسائی کے نزدیک ضعیف اور حاکم کی رائے میں ناقابل اعتبار ہیں۔
دارقطنی نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ اسماعیل کے ضعف پر اجماع ہے۔
الغرض بخاری کی ایک ایسی روایت پر جو درجہ احاد سے آگے نہیں بڑھتی
اور مجروح بھی ہے، تمام جمہور محدثین کے اس فیصلہ کو کیونکر رد کیا جاسکتا ہے

مین اپنے اس وعدہ کا ایفا کرتا ہون ۔

ہرنام کا استدلال دو باتون پر مشتمل تھا ایک یہ کہ جناب امیر اپنے خصائل و عادات کے لحاظ سے بھی مرجح حق خلافت کا رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ خود رسول اللہ نے بھی غدیر خم مین اور اسکے قبل و بعد متعدد بار اپنے بعد ولایت و وصایت علی کی صراحت فرمائی تھی ۔ اس سلسلہ مین فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات و اسناد وہی پیش کئے تھے جو اہل السنن کی کتابون مین پائے جاتے ہین اور اسلئے سنیون کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتین ہوسکتی ہین یا تو یہ کہ وہ سرے سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کرین یا یہ کہ وہ ان روایتون کا کوئی مفہوم اور بتائین ۔ ظاہر ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہین کی جاسکتی کیونکہ وہ روایات تو کتابون سے نکالی نہین جاسکتین ، اس لئے عمومًا دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتون کو ضعیف قرار دے کر ناقابل اعتنا خیال کرتے ہین اور بعض الزامی جواب کے انداز مین ان احادیث کو پیش کرتے ہین جو فضائل جناب شیخین مین ان کے یہان پائی جاتی ہین ۔ درانحالیکہ ان دونون مین سے کوئی طریقہ جواب کا مفید یقین نہین ہوسکتا ۔ کیونکہ جن روایتون کو آج ضعیف کہکر ناقابل استناد قرار دیا جاتا ہے وہ قدما کے نزدیک صد درجہ قابل وثوق سمجھی جاتی تھین اور فضائل شیخین کو جناب امیر کے حق ولایت و خلافت سے کوئی واسطہ نہین کیونکہ ایک کی

معقول وجہ انکار کی نہین ہوسکتی ۔ رہا جناب ابوسعید بزمی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ کا ایسا فرمانا صرف حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے تھا ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔

تیسری خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ نے پوشیدہ طور پر مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے بستر پر جناب امیر کو لٹا کر تشریف لے گئے ۔ اس مین شک نہین کہ حضرت علی کا رسول اللہ کے بستر پر لیٹ جانا انتہائی خطرہ کی بات تھی اور آپ کا اس خطرہ کو گوارا کر لینا جان نثاری کا ایسا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت کوئی اور نہین ہو سکتا ۔

اس واقعہ سے بھی بعض علماء اہل تسنن صرف اس لئے انکار کرتے ہین کہ بخاری مین کوئی ایسی روایت نہین پائی جاتی لیکن یہ کوئی قابل اعتبار استدلال نہین ہے کیونکہ علاوہ بخاری کے تمام کتب احادیث و تفسیر و تاریخ مین اس کا ذکر موجود ہے ۔ مسند احمد بن حنبل، سنن امام نسائی، سنن ابن ماجہ، خصائص نسائی، سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ثعلبی، تفسیر ابو حاتم رازی، تاریخ کبیر اور اسد الغابہ وغیرہ تمام کتابون مین ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکتا ہے ۔

کہ حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے جناب امیر ہی نے اسلام قبول کیا۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی ہی ایمان لائے چنانچہ دار قطنی نے ابو سعید خدری سے۔ امام احمد نے حضرت عمر سے، حاکم نے معاذ سے عقیلی نے حضرت عائشہ سے جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ نے اپنی زبان سے فرمایا کہ " مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے علی ہیں "۔

الغرض ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے امام بخاری کی ایک مجروح روایت کو استدلال میں پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسرا استدلال جناب امیر کی وصایت و امامت کے ثبوت میں ہر نامہ صاحب نے یہ پیش کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ کو " انذر عشیرتک الاقربین " کی ہدایت ہوئی تو آپ نے اپنے اعزہ و اولاد عبد المطلب و ہاشم کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں جناب امیر کو " اخی و وصیی وخلیفتی فیکم " (اپنا بھائی اور اپنا ولی عہد و جانشین) ظاہر کیا۔ اس کا جواب بھی سنیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ درانحالیکہ مسند احمد بن حنبل، خصائص نسائی، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ابن ابی حاتم، دلائل بیہقی و ابو نعیم میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اور مستند طریقہ سے مروی ہے۔ محض بخاری میں نہ پایا جانا کوئی

ساتوین خصوصیت مرزا صاحب نے حضرت علی کی یہ ظاہر کی ہے کہ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خیبر وغیرہ مین جو کار ہائے نمایان آپنے کئے وہ دوسرون سے ظاہر نہ ہو سکے بلکہ بعض موقعون پر تو تمام اکابر صحابہ رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف حضرت علی رہ گئے چنانچہ آپ کی انھین خصوصیات جرأت و وفاداری کی بنا پر رسول اللہ نے خیبر کی مہم پر روانہ کرتے وقت آپ کو "کرار غیر فرار" کے الفاظ سے یاد فرمایا۔

ان تمام جنگون مین جناب امیر نے جس غیر معمولی شجاعت و ثابت قدمی سے کام لیا اس کے اعتراف پر اہل تسنن بھی مجبور ہین لیکن خیبر کی مہم پر روانہ کرتے وقت رسول اللہ کا جناب امیر کو "کرار غیر فرار" کہنا اور جنگ احد و جنگ حنین مین تمام اکابر صحابہ یہانتک جناب ابوبکر اور جناب عمر کا بھی رسول اللہ کو تنہا چھوڑ کر چلا جانا ایسی باتین ہین جو سنیون کے لئے ناقابل قبول ہین۔ لیکن رسول اللہ کا جناب امیر کو "غیر فرار" کے لفظ سے خطاب کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس سے قبل جو صحابہ (یعنی جناب ابوبکر و جناب عمر) پرچم اسلام لیکر خیبر فتح کرنے گئے تھے اور ناکام واپس آئے وہ بھاگ آنے والون مین تھے اور جنگ حنین و جنگ احد مین تو خیر کھلم کھلا ان حضرات پر رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دینے کا الزام قائم کیا جاتا ہے۔

اہل تسنن بربنائے امام بخاری الفاظ "کرار غیر فرار" کی صحت سے

چوتھی خصوصیت مواخاۃ کی ہرنام صاحب نے ظاہر کی ہے یعنی جب رسول اللہ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد مہاجرین وانصار میں بھائی چارے کی رسم قائم کی تو جناب امیر کی مواخاۃ خود اپنی ذات سے کی اور ارشاد فرمایا۔

"انت اخی فی الدنیا والاخرۃ" "اے علی تو دنیا وآخرت میں میرا بھائی ہے" اس واقعہ سے بھی اہل تسنن صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ جناب امام بخاری اس مسئلہ میں خاموش ہیں، درانحالیکہ دیگر کتب احادیث میں بارہ صحابہ کی روایت سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

پانچویں خصوصیت ہرنام صاحب نے یہ ظاہر کی ہے کہ مسجد نبوی کے چاروں طرف جتنے صحابہ کے گھر تھے ان سب کے دروازے رسول اللہ نے بند کرادئے لیکن حضرت علی کے گھر کا دروازہ صحن مسجد کی طرف کا بند نہیں کرایا۔ یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی کتب احادیث وتاریخ میں صراحتاً موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام نسائی، حاکم، طبرانی، ترمذی، بیہقی اور ابن عساکر وغیرہ سب بالاتفاق اس واقعہ کی صحت کے شاہد ہیں۔

چھٹی خصوصیت جناب امیر کی ہرنام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ آپ رسول اللہ کے داماد یعنی اس محبوب بیٹی کے شوہر تھے جس کو جناب رسالتمآب سیدۃ نساء العالمین سیدۃ نساء المومنین، سیدۃ نساء اہل الجنۃ کے الفاظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ ایسا ہے جس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔

کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہین ہے"۔

چونکہ یہ حدیث بخاری مین بھی موجود ہے اس لئے اہل تسنن اس واقعہ سے انکار تو نہین کرسکتے لیکن وہ اس کو کوئی ایسا زیادہ اہم بھی نہین سمجھتے۔ ہوسکتا ہے کہ اس حدیث سے استخلاف جناب امیر ثابت نہ ہوسکے لیکن انکی فضیلت تمام دیگر صحابہ پر ضرور ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ امام نووی نے شرح مسلم مین بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔

آٹھوین خصوصیت مرتام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ جب سورہ براءت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کو مامور کیا کہ جا کر اہل مکہ کو اس کی تبلیغ کرین، جب وہ چلے گئے تو وحی نازل ہوئی کہ اس کی تبلیغ خود رسول اللہ کو کرنا چاہیئے یا اپنے کسی عزیز قریب کے ذریعہ سے۔ چنانچہ آپنے جناب امیر کو روانہ فرمایا کہ وہ حضرت ابوبکر سے سورہ براءت لیکر اہل مکہ کو جا کر سنائین اور جناب امیر کو یہ خدمت تفویض کرتے وقت فرمایا کہ:-

"علی منی وانا منہ ولا یودی عنی الا انا او علی" (علی مجھ سے ہے اور مین علی سے ہون اور اپنی ترجمانی یا مین خود کرسکتا ہون یا علی)

یہ واقعہ بھی اہل سنن کی تمام کتب معتبرہ احادیث و تفاسیر مین موجود ہے اور اس سے انکار ممکن نہین لیکن اہل تسنن اس کو بھی کوئی اہمیت نہین دیتے، در انحالیکہ اس سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ جو خدمت خود

انکار کرتے ہین، حالانکہ ابن اسحاق، نسائی، احمد، ابن ابی شیبہ، ابن جریر، طبرانی، بیہقی نے اور دار قطنی، خطیب اور ابن عساکر نے تو خود حضرت عمر سے انھین الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے۔ علاوہ اس کے جناب ہرنام کا یہ استدلال کہ اگر "کرار غیر فرار" کے الفاظ نکالدیے جائین تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اور زیادہ توہین متصور ہے، کیونکہ اس صورت مین حدیث کے معنی یہ ہون گے کہ حضرت علی سے قبل جو حضرات پرچم اسلام لے گئے تھے وہ خدا اور رسول کے دوست بھی نہ تھے (ملاحظہ ہو نگار ماہ مارچ ۳۵ء) رکھیا جنگ احد و جنگ حنین مین تمام اکابر صحابہ کا فرار ہو جانا، سو اگر باوجود متعدد احادیث اہل تسنن کی موجودگی کے اس سے انکار بھی کر دیا جائے تو حضرت علی کی عدیم النظیر خدمات کو ایک مخصوص امتیاز دینا لازم ہے، کیونکہ ان کے پیٹھ موڑ کر چلے جانے یا رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دینے کی ایک روایت بھی کسی جگہ نہین پائی جاتی۔

ساتوین خصوصیت ہرنام صاحب نے حدیث منزلت سے ثابت کی ہے یعنی جب غزوہ تبوک مین رسول اللہ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی مین قیام کرین، جس سے آپ کبیدہ خاطر ہوئے۔ رسول اللہ نے آپ سے فرمایا "کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی سوائے اسکے

ہونے کے بعد قافلۂ نبوی غدیر خم پر پہونچا تو رسول اللہ نے سب کو روک کر ایک تقریر فرمائی اور اس مین اپنے وصال کی خبر دیتے ہوے کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" مین جس کا مولیٰ ہون علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:۔

"مین اپنے بعد دو چیزین چھوڑے جاتا ہون ایک کتاب اللہ اور دوسری میری عترت، میرے اہلبیت اور انھین دونون کی پیروی کرنا چاہئیے"

بعض علماء اہل تسنن اس واقعہ سے بھی صرف اس لئے انکار کرتے ہین کہ امام بخاری نے اس کی روایت نہین کی اور ابن تیمیہ نے اس کو بے اصل بتایا ہے۔ حالانکہ صرف بخاری کا روایت نہ کرنا یا ابن تیمیہ کا انکار ان متعدد و متواتر تصدیقون کے سامنے کوئی حقیقت نہین رکھتا جو اس باب مین پائی جاتی ہین۔

امام المحدثین حافظ ابن عقدہ نے ایک سو ایک صحابہ سے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ امام جزری وشافعی نے اسّی صحابیون سے امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیون سے اور طبری نے پچھتّر صحابیون سے علاوہ اس کے تمام اکابر اسلام مثلاً ذہبی، صنعانی اور علی القاری وغیرہ اس حدیث کو مشہور و متواتر مانتے ہین۔

اخیر مین ہر نام صاحب نے واقعۂ قرطاس کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس کا

ذات نبویؐ سے متعلق ہوسکتی تھی اس کو صرف حضرت علی ہی انجام دے سکتے تھے۔

نویں خصوصیت کا اظہار جناب سرتاج نے اس واقعہ کے سلسلہ میں کیا ہے جب جناب امیر تبلیغ اہل یمن کے لئے مامور کئے گئے تھے اور آپ کے خلاف چند لوگوں کی شکایت سنکر فرمایا تھا کہ "مجھ سے علی کی برائی نہ کرو"۔ "فانہ منی وانا منہ وھو ولیکم بعدی" (علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارا حاکم ہے) بعض احادیث میں الفاظ "وھو ولیکم بعدی" کے نہیں پائے جاتے اور بعض میں "وھو مولیٰ کل مومن ومومنۃ" پائے جاتے ہیں۔ شکایت یہ تھی کہ جناب امیر نے خمس میں سے ایک لونڈی اپنے لئے منتخب کرلی۔ امام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت سنکر رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ "فان لہ فی الخمس اکثر من ذلک" (علی کا حصہ خمس میں اس سے بھی زیادہ ہے) یہ حدیث بھی اہل تسنن کی تمام معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اس سے جو منزلت جناب امیر کی ظاہر ہوتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

دسویں خصوصیت وہ ہے جو خطبہ حجۃ الوداع اور غدیر خم سے متعلق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حضرات شیعہ کے پاس ولایت جناب امیر کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے۔ یہ واقعہ مختصراً یوں ہے کہ جب حج سے فارغ

ان کا یہ انکار بھی درست نہین، کیونکہ اس حدیث کو امام نسائی، امام احمد بن حنبل، دارقطنی، امام رازی اور حاکم سب نے روایت کیا ہے،

یہانتک تو مین نے ہر نام صاحب کے تمام روایتی استدلالات کا خلاصہ پیش کرکے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کردی اور اس مین شک نہین کہ ان روایات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیر کی غیر معمولی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسول اللہ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اہل تسنن جواب کے دو طریقے اختیار کرتے ہین ایک یہ کہ وہ ان مین سے بعض روایات کو صرف اس لئے غلط قرار دیتے ہین کہ امام بخاری نے ان کو درج نہین کیا حالانکہ یہ ایسا ہمکیسانہ طریقہ ردّ اعتراض کا ہے کہ اسکی کمزوری مین کیا ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے، یعنی یہ کہ حضرت علی کے فضائل کے جواب مین حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے فضائل کی احادیث پیش کرنے لگتے ہین۔ اول تو جواب کی یہ صورت اس لئے بھی بیکار ہے کہ جن احادیث کو پیش کرتے ہین وہ حضرات شیعہ کی کتابون مین نہین پائی جاتین (برخلاف اہل شیعہ کے کہ وہ فضائل حضرت علی کی روایات اہل تسنن کی کتابون سے پیش کرتے ہین۔) دوسرے یہ کہ اگر فضائل شیخین کی احادیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے اصل مسئلۂ خلافت و امامت جناب امیر پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جبکہ حضرت علی کے

تعلق اول تو وصایت جناب امیر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کاغذ و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل تسنن کے نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں سے ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں۔ دوسرے راوی قبیصہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن یزید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبد اللہ ہیں جن کا شمار ضعفا میں ہے رہ گئے ایک اول راوی حضرت ابن عباس سو ان کا اسوقت وہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔

دسویں خصوصیت جناب ہرنام نے یہ ظاہر کی ہے کہ رسول اللہ نے وقت آخر میں فرمایا کہ "بلاؤ میرے حبیب کو، چنانچہ پہلے حضرت ابو بکر آئے لیکن آپنے توجہ نہیں کی، اس کے بعد حضرت عمر تشریف لائے لیکن دیکھکر پھر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ جب حضرت علی آئے تو آپنے انہیں چادر میں لے لیا اور برابر لئے رہے۔ یہانتک کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔"

ہر چند مسئلہ خلافت و ولایت سے براہ راست اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے۔ لیکن فضیلت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے یقیناً یہ نہایت زبردست دلیل ہے۔

بعض علماء اہل تسنن اس حدیث کی صحت سے بھی منکر ہیں اور میرے نزدیک

کیا تعلق تھا؟ اس کو سب نے نظر انداز کر دیا ہے اور یہی اصل سبب تمام نزاعات کا ہے۔ اس لئے آیئے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کریں۔

نبی یا رسول کا لغوی مفہوم جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کا اصطلاحی مفہوم ہمیشہ یہی قرار دیا گیا کہ نبی وہ غیر معمولی انسان ہے جو خدا کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہو، جو معجزوں کا حامل ہو، پیشین گوئیاں کرتا ہو، غیب کی باتیں جانتا ہو، بات بات میں خدا فرشتے بھیجکر اس کی مدد کرتا ہو، محالات کو ممکن بنا دینے پر قادر ہو، بالکل معصوم ہو، لغزش و غلطی سے مبرا ہو، جس کا ہر قول و فعل ہر وقت الہام خداوندی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتا ہو یعنی مختصر یہ کہ اس میں عام خصوصیات انسانی بالکل نہ پائی جائیں اور وہ ایک "غیر انسانی" انسان ہو۔

آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیں، بہ ادنیٰ تغیر الفاظ نبی یا رسول کا مفہوم آپ کو یہی نظر آئے گا لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے نبی کے اس عجیب و غریب مفہوم کی تردید کی اور تمام مذاہب میں وہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے نبوت کے اس طلسم زار کو توڑ کر اس کے حقیقی خط و خال دنیا کے سامنے پیش کئے۔

انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشرف المخلوقات صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسکو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذبات حیوانی

مرتبہ وفضیلت سے اہل التسنن کو بھی انکار نہین ۔

الغرض جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد مین بالکل حق بجانب ہین کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علی آپ کے بعد جانشین قرار دئے جائین لیکن گفتگو اس مین ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ کی اس خواہش کا حالات کے اقتضاء کے لحاظ سے پورا ہونا ممکن و مناسب تھا یا نہین ۔ اور دوسرے یہ کہ اگر حضرت علی رسول اللہ کے بعد خلیفہ قرار نہین دئے گئے تو یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہوسکے ؟

جہانتک مین نے غور کیا ہے مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون کہ خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہین ہے اور اگر کوئی جماعت اس کی قایل ہے تو اس کے معنی یہ ہین کہ اس نے نہ اسلام کی تعلیمات پر غور کیا ہے ، نہ اس کے صحیح مقصد کو اس نے سمجھا ہے اور نہ منصب نبوت کے حقیقی مفہوم سے آسے آگاہی حاصل ہے

اس سے غالباً شیعہ وسنی کسی کو انکار نہین کہ تعلیمات اسلام مذہب و سیاست دونون پر حاوی ہین یعنی اگر رسول اللہ کو ایک طرف مبلّغ احکام خداوندی کی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف آپ ایک سیاست دان فرمانروا کا منصب بھی رکھتے تھے ۔ لیکن ان دو مختلف حیثیتون کا آپ کے منصب نبوت سے

ر سکتا ہو لیکن نہ کرے ۔ ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو، اسی پر ایک نبی
کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجئے! اگر ہم یہ مان لین کہ نبی
فطرتاً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابل تعریف بات نہین
اگر وہ غیب کی باتین جان لیتا ہے تو اس کی فراست وپیش بینی بے معنی
ہے اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہین تو اس کی کامیابیان کوئی حقیقت نہین
رکھتین، اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہین سکتی، تو اس کی سلامت روی
ہیچ ہے ۔ ایک نبی کو دوسرے انسانون کے مقابلے مین امتیاز اگر حاصل
ہے تو صرف یہ کہ وہ باوجود اُن تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگون مین
پائے جاتے ہین ان کے ضبط پر دوسرے انسانون سے زیادہ قادر ہے،
وہ دوسرے انسانون کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالف
و مقابل قوتون سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک
پہونچنے کے لئے انھین اسباب ودلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسرون
کے سامنے ہین اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہونچتا ہے ۔ الغرض وہ ہماری طرح
ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش
اس دنیا مین ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم ۔ وہ اپنی
نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان
ہے لیکن اپنی تدابیر، یعنی فہم ودانش کے لحاظ سے اس کاروبار عالم مین وہ کبھی

سے مغلوب نہین ہو سکتا اگر وہ چاہے۔ بالکل اسی طرح ایک نبی، دوسرے انسانون کے مقابلہ مین صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس مین وہ تمام قوتین جو ایک انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہین، زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہین اور وہ باوجود تمام جذبات حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہین جو حد درجہ مسکین و غریب ہے، جو کبھی کسی سے انتقام نہین لیتا، جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اسکی صلاحیت نفس کی تعریف کرتے ہین۔ کیون؟ اس لئے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لیکر اپنے جذبات حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہمکو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتاً وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو بزدل و بے غیرت کہین گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے اور ہم اس کے ضبط نفس کی تعریف کرتے ہین، لیکن اگر ہم یہ جان جائین کہ اس مین قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہین پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہین۔

الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ

بناکر بھیجتے۔

اسی طرح سورۂ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم الٰہ واحد" یعنی اے رسول کہدے کہ میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمھیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں "ھل کنت الا بشراً رسولاً" کہکر اس کی اور زیادہ وضاحت کر دیجاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل میں نے عرض کیا ایک نبی کی خصوصیات میں اس کا غیب دان ہونا بھی لازمی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اسلام نے اس کی بھی نہایت پر زور الفاظ میں تردید کی ہے۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ تم سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان سے کہدو کہ "وللہ غیب السموات والارض والیہ یرجع الامر کلہ" یعنی آسمان و زمین کی پوشیدہ باتوں کا جاننے والا صرف خدا اور وہی سب کا مرجع حقیقی ہے۔ (آیت ۱۲۳۔ سورۂ ہود)

سورۂ نمل کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے :- "قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ"

کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے
پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی
عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سنکر متعجب ہو،
علی الخصوص حضرات شیعہ، جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہلبیت کے تمام
افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کروں کلام پاک سے نبوت کا مفہوم میری
سمجھ میں یہی آتا ہے اور اس سے ہٹکر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف
کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی توہین کرنا ہے ۔

نبی آخر الزمان سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا
وہ یہ تھا کہ "رسول" نوع انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے اور اس کا تعلق
فرشتوں سے ہے[۱] ۔ اس کی تردید رسول اللہ کی زبان سے یوں کی گئی ۔
قل لوکان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیہم
من السماء ملکا رسولا" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۵) یعنی اگر زمین
میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول

[۱] وما منع الناس ان یومنوا اذ جاءھم الھدیٰ الا ان قالوا ابعث اللہ
بشرا رسولا (ایمان لانے سے جس چیز نے لوگوں کو باز رکھا وہ یہ تھی کہ وہ کہا کرتے تھے
کیا خدا نے کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے ! سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۴

اسباب کے ماتحت انسان کو نفع و ضرر پہونچا کرتا ہے، ان سے بھی آپ
مستثنیٰ نہ تھے۔

ایک نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حامل معجزات
ہو اور رسول اللہ سے قبل عام طور پر خوارق عادات کا ظہور اثبات
نبوت کے لئے ضروری سمجھا تھا لیکن کلام مجید نے اس مسئلہ کو بھی ہمیشہ
کے لئے صاف کر دیا۔

جسوقت کفار نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تجھ پر اسوقت ایمان لائینگے
جب تو زمین سے ہمارے لئے چشمہ جاری کر دے یا یہ کہ تیرے پاس
کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس مین بہتی ہوئی نہرین نکالدے یا یہ کہ
تو آسمان کے ٹکڑے کر دے یا یہ کہ خدا اور فرشتون کو اپنے سامنے لے آئے
وغیرہ تو اس کا جواب رسول اللہ نے صرف یہ دیا کہ "سبحان ربی
هل کنت الا بشرا رسولا" (ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل آیات ۹۲ تا ۹۵)

اگر رسول اللہ حامل معجزہ ہوتے یا منصب نبوت مین معجزون کا دکھانا
بھی شامل ہوتا، تو اس سے زیادہ موزون و مناسب وقت کوئی ہو ہی
نہ سکتا تھا کیونکہ کفار اس پر اصرار کر رہے تھے اور ایسے وقت مین معجزہ کا
اظہار از بس مفید و کارآمد ہوتا، لیکن آپنے نہ صرف معجزہ دکھانے سے
انکار کر دیا بلکہ ان کو منصب نبوت کا صحیح مفہوم بھی سمجھا دیا کہ نبی یا رسول کو

سورۂ انعام کی آیت ۵۰ میں اس کی صراحت اور زیادہ پُرزور الفاظ میں
اس طرح کی جاتی ہے کہ :-

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا
اقول لکم انی ملک"

اے رسول کہدیجئے کہ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس خدا کی
خزانے ہیں یا میں غیب کا جاننے والا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں۔

پھر سورۂ اعراف میں اس کی وضاحت دوسرے طریقہ سے
یوں کی گئی ہے :-

"قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ ولو کنت
اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السو"

یعنی مجھے اپنے نفع و نقصان پر بھی اختیار نہیں ہے اور اگر مجھے
آئندہ کا حال معلوم ہوتا تو اپنے لئے سب بھلائیاں ہی بھلائیاں جمع
کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہونچتا۔

یہ ہیں وہ آیات قرآنی جن سے رسول اللہ کی حیثیت انسانی کو
ظاہر کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی دوسرے
انسانوں ہی کی طرح ایک انسان تھے، نہ آپ کو آئندہ کا حال معلوم تھا
نہ آپکے پاس خزائن غیب کی کنجیاں تھیں، یہاں تک کہ جن دنیادی

ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اُس سے منہ پھیر لیا۔ اسپر آپ کو اس طرح تنبیہ کی گئی :-

"عبس و تولی ان جاءہ الاعمیٰ" (سورہ عبس۔ آیت۔ ۱۔ ۲۔ ۳)

سورہ براءۃ (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ:-

"عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکاذبین"

کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے بعض جنگوں میں رسول اللہ کا ساتھ نہ دیا تھا لیکن رسول اللہ نے ان کو پھر شمول جنگ کی اجازت دیدی تھی اسپر آپ سے کہا گیا کہ جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق و تصدیق نہ ہوئی تھی، کیوں انھیں اجازت دیگئی۔

سورہ انعام کی آیت ۶۸ سے یہانتک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے[۱]

آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا بھول چوک سے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپ کو آیندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ ممکن ہے

[۱] واذا رأیت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ۔ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین

انسانی ہستی سے بالاتر ہستی سمجھنا غلطی ہے -

نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے متبرا ہے لیکن کلام مجید سے اسکی بھی تردید ہوتی ہے -

سورۂ سبا کی آیت ۴۹ مین رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے :-

"قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی انہ سمیع قریب" (یعنی کہدو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار مین ہون اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہون تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورۂ مومن، آیت ۵۵ مین ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا کہ "استغفر لذنبك وسبح بحمد ربك" (اپنی غلطی سے توبہ کر اور خدا کی حمد بیان کر)

سورۂ محمد آیت ۱۹ مین پھر "واستغفر لذنبك وللمومنین والمومنات" کے الفاظ ارشاد ہوتے ہین -

سورۂ فتح کی آیت ۱-۲ مین ارشاد ہوتا ہے :-

"انا فتحنا لك فتحا مبینا لیغفر لك اللہ ما تقدم من ذنبك"

یہان بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے -

نہ ہوسکتی تھی، کیونکر درست ہوسکتا ہے۔ اتنی بحث کے بعد جواب کا ایک پہلو
واضح ہوجاتا ہے کہ اگر منجانب رسول اللہ وصایت جناب امیر کو صحیح تسلیم کرلیا
جائے۔ تو بھی اس کا امکان رہجاتا ہے کہ رسول اللہ کا یہ انتخاب موزوں نہ رہا ہو
یا یہ کہ صحابہ سے آپ کو خلیفہ نہ بنانے مین غلطی ہوئی ہو، مگر اس غلطی سے یہ نتیجہ تو
نہیں نکل سکتا کہ انھون نے قصداً ازراہ عناد و نفاق آپکے حقوق کو پامال کیا
ہوتا ہم مین جواب کے اس پہلو کو ترک کرکے ایک اور پہلو اختیار کرتا ہون۔
سب سے پہلے یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ آیا خلافت کا مسئلہ مذہب اسلام سے
تعلق رکھتا تھا یا سیاسیات اسلام سے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے کیونکہ
رسول اللہ کے بعد آن کی جانشینی کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا لیکن حقیقت
یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ اصولاً ہونا چاہیے بلکہ اس کا
تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس
مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں
نہین کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی
کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔ اب اسی کے ساتھ واقعات و حالات پر بھی
ایک نگاہ ڈالئے کہ آن سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اسمین شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ آن کے بعد جناب امیر

بعض حضرات اسے منصب نبوت کی توہین سمجھیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی عظمت وجلالت صرف اسی طرح ثابت ہوسکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

مین کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کسی معصیت یا گناہ مین مبتلا ہوسکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس مین کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان، اور بھول چوک، کہتے ہیں اور اسکا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ مین پہلے عرض کرچکا ہوں کہ رسول اللہ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی والہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا، لیکن آپ کی سیاسی زندگی مین اسکا امکان تھا کہ آپ سے کبھی کوئی فروگذاشت ہوجائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات سے اور خود سیرۃ نبوی کے بعض واقعات سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے، پھر جب خود ذات نبوی کے متعلق غلطی یا لغزش کا امکان تھا تو خلفاء وائمہ یا اہلبیت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد

چاہتے تو عملاً کر سکتے تھے اور تمام اکابر صحابہ کو بلا کر اپنے سامنے حضرت علی
کے ہاتھ پر بیعت لے سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رسول اللہ کی
یہ خواہش، کسی وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف
الفاظ مین اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلام مجید مین بھی ہوتے،
لیکن چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے نہ تھا بلکہ مصلحِ سیاست سے تھا، اس لیے
کلام مجید مین تو اس کا ذکر ہو ہی نہ سکتا تھا اور سیاسی حیثیت سے اس کا قطعی
تصفیہ رسول اللہ نے اس لئے نہ کیا کہ اول تو یہ اسلام کی روح و ستوریت
کے خلاف ہوتا اور دوسرے یہ کہ آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیر کا خلیفہ
بن جانا آسان نہین ہے اور ان کے اتنے مخالف موجود ہین کہ اس پر اصرار
کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا۔

شیعی روایات کے لحاظ سے رسول اللہ کے وصال کے بعد حضرت علی
کے طرفدارون مین صرف تین شخص تھے (سلمان انصاری۔ ابوذر۔ المقداد
بن الاسود الکندی) اگر واقعی تمام مہاجرین و انصار و اکابر عرب مین سے
صرف تین شخص (بعض شیعی روایات کے مطابق دو چار اور) جناب امیر کے
طرفدار تھے اور باقی سب مخالف تو یقیناً آپ خلافت کے لئے نامزد ہو ہی
نہ سکتے تھے اور اگر اس کی کوشش کی جاتی تو بھی کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی
ممکن ہے کہ رسول اللہ نے انھین حالات کو دیکھ کر آخر وقت مین سکوت فرمایا ہو

خلیفہ قرار دئے جائیں جیسا کہ آپنے بارہا اشارتاً وکنایتاً کیا بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور وہ مسئلہ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا، اس لئے رسول اللہ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا (علی الخصوص اس وقت جبکہ خدا کی طرف سے بھی کوئی ہدایت نہ پہونچی تھی) کوئی معنے نہ رکھتا تھا، اور اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی سی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بارہا رسول اللہ نے جناب امیرؑ کو ولی، مولیٰ، وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا لیکن جب آپکے وصال کا وقت قریب آیا تو آپنے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔

اس وقت کا سب سے زیادہ اہم واقعہ جس سے حضرات شیعہ خلافت جناب امیرؑ پر استدلال کرتے ہیں، واقعۂ قرطاس ہے۔ اول تو اسکے وقوع میں اشتباہ ہے لیکن اگر اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی اب یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ نے خلافت و نیابت ہی کا فیصلہ کرنے کے لئے کاغذ قلم طلب فرمایا تھا۔ بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقصد کچھ اور تھا یا اگر یہی تھا تو آپنے دوبارہ غور فرمانے کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔

واقعۂ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا وصال نہیں ہوا بلکہ ہوش وحواس کے عالم میں اتنا وقت آپ کو ملا کہ اگر آپ اس مسئلہ کا بھی جناب امیرؑ فیصلہ کرنا

حالانکہ حضرات شیعہ بھی قرآن وحدیث میں یہی وجہ امتیاز قائم کرتے ہین کہ
ایک وحی متلو ہے اور دوسری وحی غیر متلو یعنی ایک کا تعلق فرمان خداوندی
سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہ کی ذاتی رائے سے۔ ہم اس سے قبل ظاہر
کر چکے ہین کہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ نفس مذہب سے نہ تھا بلکہ سیاسیات سے
تھا اسی لئے کوئی وحی متلو (قرآن مجید کے اندر) اس باب مین نہین پائی
جاتی اور اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسب ذیل
باتین معارض نظر آتی ہین۔

(۱) اگر خلافت جناب امیر کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے
کلام مجید مین ہونا چاہیئے تھا حالانکہ نہین ہے۔

(۲) اگر واقعی فرمان خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ
سمجھتے ہین تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح
الفاظ مین اس کا ذکر کلام مجید مین ہوتا، رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت
علی کی باقاعدہ خلافت سب لوگون سے تسلیم کرا کے رخصت ہوتے، حالانکہ
یہ بھی تاریخ سے ثابت نہین۔

(۳) اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علی ضرور
اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکام مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے
اس لئے باوجود تمام مخالفتون کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے۔

اور اس کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا ہو۔ اس مین شک نہین کہ رسول اللہ نے اپنی خواہش کا اظہار تو اپنی زندگی مین کر دیا تھا لیکن یہ آپ کی ایک رائے تھی حکم نہ تھا، آپ کی ذاتی خواہش تھی، فرمان خداوندی نہ تھا، گویا دوسرے الفاظ مین یون کہیے کہ رسول اللہ کا حضرت علی کو ولی و وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرنا صرف یہ معنی رکھتا تھا کہ اگر ان کے بعد خلافت کے لئے انتخاب عمل مین آئے تو ان کی رائے حضرت علی کے حق مین شمار کی جائے پھر یہ بھی آپ کی انتہائی فراست تھی کہ وصال کے وقت آپنے اپنی جانشینی کا مسئلہ طے نہین فرمایا اور نہ ممکن ہے وہ فتنہ و فساد جو حضرت عثمان کے بعد شروع ہوا، آپکے وصال کے بعد ہی برپا ہو جاتا اور اسلام کی عمر اور زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی۔

اب ایک صورت اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی ہے یعنی یہ کہ خود حضرت علی کے طرز عمل سے ہم کو کیا بات ظاہر ہوتی ہے۔ حضرات شیعہ کا اعتقاد ہے کہ ولایت و وصایت جناب امیر کا اعلان رسول اللہ نے حسب فرمان خداوندی کیا تھا یعنی نص قطعی سے آپ کی ولایت ثابت ہوتی ہے۔ در انحالیکہ کلام مجید مین کوئی آیت اس کی تائید مین نہین ملتی، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ کا یہ ارشاد ہی نص قطعی یا وحی متلو کی حیثیت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہین کہ آپکے تمام اقوال کو وحی متلو نہ سمجھا جائے اور حدیث و قرآن کے امتیاز کو اٹھا دیا جائے

بسر کردیا اور انھون نے کبھی کوئی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشاء خداد رسول کو پورا کرنے کی کوشش کی ۔

حضرت علی اپنے اخلاق کی مضبوطی، اپنی غیر معمولی شجاعت وبہادری اپنی اسلامی محبت، اپنی جذبۂ فدویت وقربانی کے لحاظ سے اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے متعلق یہ خیال نہین ہو سکتا کہ محض کسی دنیاوی مصلحت کی بناپر دینی احکام کی پابندی مین انھون نے کبھی تسامح سے کام لیا ہو۔ اس لئے حضرت علی کا خلفاء ثلٰثہ کے زمانہ مین صد درجہ امن پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح ومشورہ مین شریک ہونا سوائے اسکے اور کسی سبب کی بناپر نہین ہو سکتا تھا کہ آپ مسئلۂ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لئے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے ۔

اس سے قبل ہم خود شیعی روایات کی بناپر یہ ظاہر کر چکے ہین کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد صرف انگلیون پر گنے جانے والے چند نفوس حضرت علی کے طرفدارون مین پائے جاتے تھے اور چونکہ آپ خود بھی اس کو جانتے تھے کہ لوگ آن کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہون گے ۔ اس لئے سیاسی مصالح کے لحاظ سے آپ نے کبھی اس کی خواہش نہین کی اور رائے عامہ کے خلاف

لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ آپنے خود حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔ اگر حضرت علی حضرت ابوبکر کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپکے نزدیک خلاف منشاء خداوندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لئے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراسم موالات ترک کر دیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا۔ ممکن ہے کہ آپنے مصلحتاً اس کو اس خیال کی بنا پر گوارا کر لیا ہو کہ حضرت ابوبکر ضعیف ہیں اور جب چند دن بعد ان کا انتقال ہو جائے گا تو پھر خلافت اُن کو ملے ہی گی، لیکن حضرت ابوبکر کے بعد بھی ان کو اس کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور وہ حضرت عمر کے دور خلافت میں بھی اسی رواداری و موالات سے کام لیتے ہیں۔ حتی کہ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان کا زمانہ آتا ہے اور حضرت علی بدستور نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت کا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسول، لیکن حیرت ہے کہ جناب امیر نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں

مصلحت یا سیاسی اختلافات سے متعلق تھا۔ جب غیر مذہبی معاملات مین لغزش
و غلطی کا امکان رسول اللہ سے بھی تھا تو خلفاء کا کیا ذکر ہے ؟
اس سلسلہ مین ایک امر اور قابل غور رہجاتا ہے وہ یہ کہ حضرت علی کے
طرفدار اتنے کم کیون تھے اور آن کی خلافت کی راہ مین کونسے اسباب حائل تھے
رسول اللہ کو جو تعلق جناب امیر کی ذات سے تھا وہ کسی سے مخفی نہین۔
اور جو خدمات آپنے انجام دین وہ بھی سب پر عیان ہین۔ رسول اللہ کو آپ سے
عشق تھا اور آپ بھی رسول اللہ کے ایسے فدائی تھے کہ کوئی دوسرا اس بات مین
ہمسری کا دعوی نہین کر سکتا۔ پھر یہ فطرت انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے
متعدد چاہنے والے ہوتے ہین تو ان مین سے ہر ایک اپنا ہی درخور حاصل کرنا
چاہتا ہے اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے۔ تو دوسرون کو
اچھا نہین معلوم ہوتا۔ رسالتماب جس خصوصیت کا اظہار جناب امیر سے
کیا کرتے تھے، اُسے فطرتاً تمام صحابہ کے لئے باعث رشک ہونا چاہئے تھا
اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیر کی رسول اللہ
کے دل مین تھی بالکل وہی دوسرون کی نگاہ مین تھی،
اس کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے ایک عام جذبہ ناپسندیدگی کا
سبب یہ بھی تھا کہ غزوات مین سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنون کو قتل کیا
تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ

کبھی کوئی قدم ایسا نہین اُٹھایا جو فتنہ وفساد کا باعث ہوتا ۔ حضرات شیعہ جناب امیر کے اس سکوت کو جس چیز سے چاہین تعبیر کرین ۔ لیکن مین اس کا سبب صرف یہ قرار دیتا ہون کہ آپ صحیح معنے مین تعلیمات اسلام کے مقصد سے واقف تھے اور روح دستوریت یا رائے عامہ کے منافی کوئی کام کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے ۔

اسمین شک نہین کہ خلفا ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہین کیا گیا ۔ خیر خلیفہ اول کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت نازک تھا اور اگر رائے عامہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس تعویق سے خرابیان پیدا ہونیکا اندیشہ تھا ۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافت کے وقت یہ سبب بھی پیدا نہین تھا اور یقیناً انکی خلافت نامزدگی کی صورت سے ہوئی جو تعلیمات اسلامی کے منافی تھی ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک عربون مین اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ انتخاب حکمران کے مسئلہ مین صحیح معنی مین دستوری حکومت کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکتے علاوہ اس کے جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا ۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نتیجہ کچھ اور پیدا ہوتا تو اب اس سے بحث فضول ہے ۔ کیونکہ اس کا تعلق مذہب سے تھا ہی نہین اور جو کچھ ہوا وہ سب سیاسی

طرفدار آپ کا نہ تھا۔

اس مین شک نہین کہ تاریخ اسلام کا یہ حادرجہ دردناک واقعہ ہے کہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس مین اختلافات شروع ہوگئے لیکن ایسا ہونا لازم تھا، کیونکہ جس وقت تک رسول اللہ زندہ رہے اسوقت تک توخیر کسی کو چون وچرا کا موقعہ ہی نہ تھا۔ مذہب وسیاست دونون کی باگ آپکے ہاتھ مین تھی لیکن آپکے بعد ان دونون مین تفریق ہو جانا اور مختلف سیاسی ادارون کا قیام بالکل قدرتی امر تھا کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہوچکا تھا اور کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو باہمی اختلافات کی صورت مین کسی خدائی فیصلہ کا اعلان کرکے سب کو خاموش کرسکتا۔

اس لئے رسول اللہ کے بعد مسئلہ خلافت مین تین جماعتین تین مختلف رائین رکھنے والی پیدا ہوگئین ایک شیعی جماعت جو اس بات کی قایل ہے کہ خلافت کے اولین حقدار جناب امیر تھے اور اہلبیت ہی مین اس سلسلہ کو قائم رہنا چاہیئے یعنی سوائے آل رسول کے کوئی اور مستحق امامت وخلافت نہین ہے، دوسری جماعت خارجیون کی، جو اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہین دیتے اور ان کے نزدیک ایک حبشی غلام بھی خلیفہ ہوسکتا ہے اگر وہ اس کا اہل ہے تیسری جماعت سنیون کی ہے جنھون نے بین بین راستہ اختیار کیا لیکن حقیقتاً وہ کچھ نہ تھا یون تو وہ اس امر کے قایل ہین کہ خلافت خاندان قریش کے لئے

جو کچھ ہوا اسلامی نقطۂ نظر سے تھا اور اس مین ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اہل عرب اپنی کیفیت پر و طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کانٹا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ آپ رسول اللہ کے بھائی تھے، داماد تھے، لیکن عربوں کی نگاہ مین بیٹی داماد کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہین سمجھا جاتا تھا کہ رسول اللہ کے بعد اس کا کوئی اثر پڑ سکتا۔ بہ نسبت ایام جاہلیت کے عہد اسلام مین عورت کی معاشری سطح کافی بلند ہو گئی تھی لیکن نہ اتنی کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بغیر کسی عذر صحیح کے دوسری شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا یا یہ کہ طلاق دینے مین کچھ لیس و پیش کیا جاتا۔ شادی کرنا اور بیوی کو چھوڑ دینا ان کا روز کا مشغلہ تھا اور وہ تعلقات جو نکاح کے سلسلہ مین قائم ہوا کرتے تھے صرف وقتی اہمیت رکھتے تھے، اور ان کا کوئی پایدار اثر نہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے حضرت علی کا داماد ہونا، اہل عرب کے نزدیک کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا کوئی وزن ہوتا، رہ گیا رسول اللہ کا اپنی زندگی مین بار ہا جناب امیر کی خدمات کو غیر معمولی طور پر سراہنا اور ان کو مولیٰ، وصی یا ولی کے الفاظ سے یاد کرنا، سو اس کو کوئی مذہبی اہمیت تو دی نہین گئی اور نہ دینا چاہیئے تھی۔ اس سے الٹا نقصان یہ ہوا کہ لوگ آپ سے زیادہ جلنے لگے اور رسول اللہ کے وصال کے بعد آپ کے مخالفین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ حضرات شیعہ کے قول کے مطابق سوائے دو چار آدمیون کے اور کوئی

کس جماعت سے پہونچا۔

(۱) جس حد تک مذہب و اتحاد اسلامی کا تعلق ہے، اہل سنت قطع نظر اس سے کہ وہ تعیین خلافت کے مسئلہ میں حق پر ہیں یا نہیں، بڑی حد تک محفوظ ہیں کیونکہ خلافت کے مسئلہ کو سب سے پہلے اجتماعی و مذہبی حیثیت سے دیکھنے والی وہی جماعت ہے۔ رسول اللہ کا انتقال ہوتا ہے۔ ایک جماعت حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے جس کے اتباع میں سب لوگ (سوائے چند افراد کے) ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس سیاسی فیصلہ کو مذہبی حیثیت دیکر اتحاد و اجتماع کی ایک معقول صورت دیدیتے ہیں۔ ممکن ہے حضرت علی نے اس کو پسند نہ کیا ہو لیکن انھوں نے بھی اس اجتماعی فیصلہ کا کافی احترام کیا، اور اپنے حق خلافت کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت ایک مختصر سی جماعت چند افراد کی ضرور ایسی تھی جو اس فیصلہ سے خوش نہ تھی لیکن اس کو کوئی جداگانہ مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ اسے ایک مختصر سا سیاسی ادارہ کہنا چاہیئے جس کو ممکن ہے حضرت علی کی دلی حمایت حاصل رہی ہو لیکن عملی حیثیت سے آپ نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس جماعت نے یہ خیال کیا ہو کہ حضرت ابوبکر کے بعد تو سوائے حضرت علی کے کوئی دوسرا خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے چند دن اور انتظار کر لیا جائے، لیکن اتفاق کہئے یا فریق ثانی کا حسن تدبر کہ حضرت

مخصوص ہے لیکن عملاً انھون نے ترک فرمانروا‌ؤن کو بھی خلیفہ تسلیم کیا جن مین قریش کیا عرب کے کسی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

حضرات شیعہ اس باب مین جن احادیث سے استناد کرتے ہین ان سے اہلبیت کے مرتبہ کی بلندی ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن مین یہ کبھی ماننے کے لئے طیار نہین ہو سکتا کہ اسلام جس نے جمہوریت کی بنیاد دنیا مین قائم کی وہ اسقدر تنگ نظر ہو سکتا ہے کہ سیادت و قیادت کو ابدالآباد تک صرف رسولؐ کے خاندان کے لئے مخصوص کر دے۔ مذہب اسلام کی خصوصیت اس کا جذبہ مساوات ہے یعنی وہ رنگ و نسل کا امتیاز مٹا کر تمام انسانون کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے اور وہ سطح صرف بلندی اخلاق کی ہے۔ اس لئے امامت و خلافت کو آل رسول کے لئے مخصوص کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ رسول اللہ نے بجائے جذبہ جمہوریت کے شخصی و استبدادی حکومت کی حمایت کی، جو قطعاً روح اسلام کے منافی ہے؛ سنیون کا طرز عمل اس باب مین قطعاً غیر فیصلہ کن ہے وہ ایک طرف شیعون کے بھی ہمنوا ہین اور دوسری طرف خارجیون کے بھی

یہان غالباً اس بحث کا نہ موقع ہے نہ ضرورت کہ ان تینون مین کس جماعت کی رائے جمہوریت اسلام کے مفہوم کے لحاظ سے زیادہ قابل قبول ہے لیکن ان تینون جماعتون کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کس کو کب مذہبی حیثیت دی گئی اور اتحاد اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان

امیر معاویہ بظاہر بیعت سے انکار تو نہ کرتے تھے لیکن حقیقتاً وہ خود اپنی
حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور اسکے لئے بہانہ یہ ڈھونڈھا کہ پہلے قاتلان عثمان انکے
حوالہ کر دئے جائیں اسکے بعد وہ بیعت کرینگے حضرت علی اس مطالبہ کو پورا نہ کرسکتے تھے کیونکہ
قاتلان عثمان کی تعیین اور انکے خلاف شرعی ثبوت کی فراہمی ممکن نہ تھی آخر کار اسی بات پر حضرت
علی اور امیر معاویہ میں جنگ ہوئی جو جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے اس جنگ کا سلسلہ کئی مہینہ تک
قائم رہا اور اسمیں شک نہیں کہ حضرت علی کی کامیابی کے امکانات بہت قوی تھے لیکن عمرو ابن العاص
کے مشورہ سے امیر معاویہ نے نیزوں پر کلام مجید بلند کر اکے مصالحت کی گفتگو
شروع کر دی اور جن لوگوں پر فیصلہ کا انحصار رکھا گیا تھا انھوں نے کھلم کھلا
امیر معاویہ کا ساتھ دے کر دفعتہً تاریخ اسلام کے رخ کو پلٹ دیا۔ اس کا
ایک خراب نتیجہ تو یہ ہوا کہ حضرت علی کی فوج میں سے ایک جماعت اس
گفتگوئے مصالحت سے برہم ہو کر علیحدہ ہو گئی (جسے خوارج کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے) اور اس نے اپنی بغاوتوں سے اتحاد اسلامی کو جس قدر
نقصان پہونچایا وہ اہل تاریخ سے مخفی نہیں یہاں تک کہ حضرت علی کی شہادت
بھی اسی جماعت کے ایک فرد کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ
امارت و حکومت خاندان بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اسلام میں ملوکیت
کی بنیاد پڑ گئی جو قطعاً تعلیمات اسلام کے منافی تھی۔ لیکن با ایں ہمہ
طرفداران علی نے ابھی تک کوئی علیحدہ مذہبی حیثیت قائم نہیں کی اور تمام

علی کو پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس دوبارہ ناکامی سے طرفداران
علی کو زیادہ صدمہ پہونچنا چاہئیے تھا اور پہونچا، لیکن حضرت علی نے پھر بھی اتحاد
اسلامی کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس جماعت کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیا۔ تیسری
بار حضرت عثمان کی نامزدگی خلافت کے وقت پھر اسی ناکامی سے سامنا ہوا اور
حضرت علی نے پھر اسی صبر و سکون سے کام لیا۔ الغرض تینوں خلفاء کے دور مین
طرفداران علی کی جماعت کو صرف ایک سیاسی فریق کی سی حیثیت حاصل تھی
اور اس نے کوئی مذہب کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ جب حضرت علی کا دورِ خلافت
آیا اور آپکے ہاتھ پر جمہور نے بیعت کی تو پھر طرفداران و غیر طرفداران علی کا
کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا کہ اس کی بناء پر کوئی مذہبی تفریق قائم ہو سکتی۔
لیکن جس زمانہ مین آپنے منصب خلافت قبول کیا، وہ ایسا نازک و پر آشوب
زمانہ تھا کہ مذہبی تفریق سے زیادہ خطرناک سیاسی تفریق پیدا ہوگئی تھی
اور حضرت عثمان کی وجہ سے جو غیر معمولی اقتدار بنوامیہ کو حاصل ہوگیا تھا
اس نے بجائے مذہب اسلام کے حکومت اسلام کی بنیاد ڈال کر اتحاد اسلامی
کے شیرازہ کو منتشر کر دیا تھا لیکن جہانتک امکان مین تھا جناب امیر نے
اسلام کی مذہبی روح کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور شاید وہ پوری طرح
اس مین کامیاب ہوجاتے اگر جنگ صفین مین فریق ثانی کی سیاسی چال
کامیاب نہ ہوجاتی۔

ان کی کوئی انتہا نہین ہے۔ طبرستان و دیلم مین جو ریاستین زیدیون کی قائم ہوئین وہ یمین کی زیدی ریاست سے بوجہ بُعد متحد الخیال نہ ہوسکین اور عراق کے زیدی چونکہ دار الحکومة سے قریب تر تھے اس لئے اُنھون نے تقیہ یا کتمان کو بھی اپنے عقائد مین شامل کر لیا۔

غلاۃ مین بہ لحاظ عقائد جو تفریق پیدا ہوئی وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرامطہ۔ اسماعیلی، نصیری، علی اللہی سب اس اجماع کے مختلف گروہون نے تمام ہین اور پھر ان مین سے بعض جماعتین ایسی رونما ہوئین جنھون نے امامت کے لئے اہلبیت ہونا بھی ضروری قرار نہین دیا۔ مثلاً کیسانی جو محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قابل ہین یا حروفی جو فضل اللہ استرآبادی کو امام مانتے ہین۔ شیعیان علی مین سب سے زیادہ اہم جماعت وہ ہے جو امامیہ کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن اس مین بھی وہی اختلاف خیال نظر آتا ہے۔

ابتداء عہد اسلام یا خلفاء اربعہ کے وقت مین منصب امامت کیلئے جو قاعدہ مقرر تھا (خواہ اس کی پابندی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو) یہ تھا کہ اس کا انتخاب جمہور کی رائے سے کیا جائے۔ (بعد کو خوارج نے بھی یہی اصول اختیار کیا۔) رائے دہندگان کے لئے تین شرطین تھین۔ ایک کہ وہ ثقہ ہو دوسرے یہ کہ شریعت سے آگاہ ہو اور تیسرے یہ کہ اس کی قوت فیصلہ و انتخاب صحیح ہو۔

اختلافات بدستور سیاسی حیثیت اختیار کئے رہے۔ اس کے بعد جب امام حسن کا انتقال ہوا جس کو "شہادت" کہا جاتا ہے تو علویین کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہوئے اور آخرکار جب امام حسین کا مشہور واقعۂ قتل کربلا میں پیش آیا۔ تو صورت ناقابل برداشت ہوگئی اور اس وقت کی تمام ناکامیوں کا احساس اتنا شدید ہوگیا کہ طرفداران علی کی سیاسی تحریک نے مذہبی صورت اختیار کرلی اور وہ مطالبات جو پہلے صرف سیاسی حیثیت رکھتے تھے اُنھوں نے مذہبی رنگ اختیار کرلیا، اور مسئلہ امامت اس حد تک جزو ایمان قرار پاگیا کہ جب تک کوئی اسے تسلیم نہ کرے نجات اخروی ناممکن ہے۔ اس سے ایک نقصان تو ان کو یہ پہونچا کہ سیاسی مرکزیت ختم ہوگئی اور دوسرا یہ کہ مذہبی حیثیت سے "امام وامامت" کی تعبیرین اتنی مختلف کی گئیں کہ مذہبی یکجہتی بھی قائم نہ رہ سکی اور شیعہ جماعت اپنے عقائد کے لحاظ سے پارہ پارہ ہوگئی۔

ان کا ایک گروہ جو زیدی کہلاتا ہے وہ امام کو اس دنیا کا ایک انسان سمجھ کر اسکی رہنمائی کا قائل ہوا،

دوسرا گروہ امامی دبی زبان سے حلول کو بھی تسلیم کرنے لگا۔ اور تیسرا گروہ جو غلاۃ کے نام سے موسوم ہے، کھلم کھلا امام کو خدا کا ایک جزو بلکہ عین خدا کہنے لگا۔ پھر اس کے بعد جو انشعابات ان مین پیدا ہوئے

شیعیان علی یا مخالفین بنی امیہ کی بڑی جماعت کو برہم کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ امام حسین رسول اللہ سے قریب تر رشتہ رکھنے کی وجہ سے زیادہ اہل امامت کے تھے اور تیسرے یہ کہ (بروایت اہل شیعہ) امام حسن ان کو نامزد بھی کر گئے تھے علاوہ اسکے امام حسین کی زندگی مین واقعۂ کربلا ایک ایسا اہم واقعہ رونما ہوا کہ اگر امام حسن کی اولاد مین کوئی دعویدار خلافت وامامت ہوتا بھی تو امام حسین کی اولاد کے مقابلہ میں انکو کون پوچھتا علی الخصوص ایسی حالت مین کہ ان کے بیٹے امام زین العابدین یزدگرد (شاہ ایران) کی بیٹی کے بطن سے تھے اور امام حسن کی کوئی بیوی اس مرتبہ کی نہ تھی۔

الغرض امامیہ جماعت کی عظیم الشان شاخ وہی ہے جو سلسلۂ امام حسین کی اولاد مین سلسلۂ امامت کی قائل ہے اور اثنا عشری کہلاتی ہے۔ رسول اللہ کے بعد ان کے بارہ امامون کے نام سلسلہ وار یہ ہین۔

(۱) حضرت علی مرتضیٰ (۲) امام حسن المجتبیٰ (۳) امام حسین الشہید۔ (۴) امام زین العابدین السجاد (۵) امام محمد الباقر (۶) امام جعفر الصادق (۷) امام موسیٰ الکاظم (۸) امام علی الرضا (۹) امام محمد التقی (۱۰) امام علی النقی (۱۱) امام حسن العسکری (۱۲) محمد المہدی۔

لیکن اہلبیت مین سلسلۂ امامت کی قائل جماعت بھی کسی ایک خیال کی قائم نہ رہ سکی اور متعدد مختلف الخیال گروہ اس مین قائم ہو گئے بعض اختلافات

اُمید وار امامت کے لئے حسب ذیل صفات ضروری خیال کی گئیں۔
(۱) ثقہ ہو (۲) شریعت کا اجتہادی علم رکھتا ہو (۳) فصیح و بلیغ
ہو (۴) سماعت و بینائی اور اعضا جسمانی مین کوئی نقص نہ ہو (۵)
معاملات کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو (۶) جہاد کی ہمت
و جرأت اس مین پائی جائے (۷) قریش مین سے ہو۔ حضرات شیعہ یہان
سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ وہ اہلبیت یعنی حضرت علی اور جناب
فاطمہ کی اولاد مین سے ہو۔

حضرت علی کی امامت کو "ولنص قطعی" کے ماتحت قرار دیتے ہین
اور آپ کے بعد امام حسن کی امامت کے قایل ہین کیونکہ حضرت علی کے بڑے
بیٹے وہی تھے اور ان کے خیال کے مطابق جناب امیر کے نامزد کئے ہوئے
بھی تھے۔ اگر جناب فاطمہ کے صرف ایک ہی بیٹا ہوتا تو راستہ صاف
تھا لیکن چونکہ آپ کے دو صاحبزادے تھے، اس لئے امام حسن کے بعد اختلاف
پیدا ہونا قدرتی امر تھا، کیونکہ اہلبیت ہونے کی حیثیت سے جس طرح امام حسین
کی اولاد مدعی امامت ہوسکتی تھی بالکل اسی طرح امام حسن کی اولاد بھی۔ لیکن
ایک بڑی جماعت نے امام حسن کے بعد ان کی اولاد کو اس منصب کا مستحق نہین
جانا اور امام حسین کے خاندان مین اس کو منتقل کر دیا۔ اس کا ایک سبب
یہ تھا کہ امام حسن نے بحق امیر معاویہ دعوائے خلافت سے دستبردار ہو کر

(۱۲) سلسلۂ امامت امام موسیٰ کاظم پر ختم ہو گیا۔

(۱۳) امام موسیٰ کاظم کے بعد امامت آپکے بڑے بیٹے احمد کی طرف منتقل ہوئی نہ کہ امام علی الرضا کی طرف۔

(۱۴) امام علی الرضا کے بعد ان کے بیٹے محمد بہت چھوٹے تھے اس لئے امامت کی تعلیم وہ اپنے باپ سے حاصل نہیں کر سکے۔

(۱۵) امام محمد النقی کے بعد بجائے علی النقی کے موسیٰ مستحق خلافت تھے

(۱۶) امام علی النقی کے بعد بجائے حسن العسکری کے دوسرے بیٹے جعفر کو امام ہونا چاہیئے۔

(۱۷) امام حسن العسکری نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اس لئے امامت کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

(۱۸) امام حسن العسکری کا ایک لڑکا جعفر نامی کسی کنیز سے تھا، اس لئے آپکے بعد اسے امام ہونا چاہیئے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اختلافات تھے جن کی بنا پر کوئی جماعت شیعہ کے نام سے موسوم ہوئی اور کوئی قطعیہ کے نام سے، کوئی واقفیہ کہلائی اور کوئی حارثیہ، کسی نے جعفریہ کا لقب اختیار کیا اور کسی نے اسماعیلیہ۔

الغرض جب تک شیعہ جماعت صرف ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت اختیار کئے رہی، اس میں ایک نوع کا اتحاد بھی پایا جاتا تھا لیکن جب حضرت علی

ذیل مین درج ہین :۔

(۱) امام حسن العسکری کا انتقال نہین ہوا بلکہ آپ غائب ہوگئے ہین اور پھر ظاہر ہون گے ۔

(۲) امام حسن بغیر اولاد چھوڑے ہوئے وفات کر گئے لیکن آپ پھر زندہ ہوکر ظہور کرین گے ۔

(۳) امام حسن نے اپنے بعد اپنے بھائی جعفر کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا

(۴) جعفر نے اپنے بعد کوئی اولاد نہین چھوڑی ۔

(۵) حضرت علی کے بعد انکے بیٹے محمد الحنفیہ امام تھے ۔

(۶) امام حسن کے ایک لڑکا آپ کی وفات سے دو سال قبل ہوا تھا جس کا نام محمد تھا ۔

(۷) امام حسن کے ایک لڑکا ضرور تھا لیکن وہ آپ کی وفات کے ۸ ماہ بعد پیدا ہوا ۔

(۸) امام حسن چونکہ لاولد تھے اس لئے دنیا امام سے خالی ہوگئی ۔

(۹) امام حسن کے ایک بیٹا تھا لیکن اس کا حال معلوم نہین ۔

(۱۰) امام کا پایا جانا ضروری ہے لیکن یہ نہین معلوم کہ وہ اولاد امام حسن مین سے ہے یا نہین ۔

(۱۱) سلسلۂ امامت امام علی الرضا پر ختم ہوگیا اور آخری امام کا ہنوز انتظار ہے ۔

جناب امیرؑ، اور معصومیت امام کی تصدیق جزو مذہب سمجھتے ہین تو وہ بھی
نامسلم ہین ۔

اس تمام گفتگو کے بعد حسب ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہین ۔
۱ ۔ جس حد تک روایات کا تعلق ہے اخلاق و فضائل کے لحاظ سے
حضرت علی کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے اور رسول اللہ کی روحانی خلافت
کے لئے اُن سے زیادہ موزون کوئی اور نہ تھا لیکن چونکہ رسول اللہ کے بعد بلا فصل
خودمختارانہ طور پر سیاسی خدمات انجام دینے کا موقع انھین نہین ملا، اس لئے
اس امر کا فیصلہ کہ رسول اللہ کے بعد سیاسی جانشین ہونے کی حیثیت سے بھی
آپ فرزحج حق رکھتے تھے اب ممکن نہین ۔
۲ ۔ رسول اللہ یقیناً اپنے بعد حضرت علی کی خلافت کے متمنی تھے اور آپ نے
اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا، لیکن آپ کی اس خواہش کا تعلق وحی یا فرمان
خداوندی سے نہ تھا بلکہ صرف آپ کی ذاتی رائے سے تھا اور اس کا مفہوم
یہ تھا کہ اگر حضرت علی کی خلافت کا امکان ہو یا اُن کی خلافت کا مسئلہ بحث
مین آئے تو آپ کی رائے اُنکے حق مین شمار کی جائے ۔
۳ ۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد حالات حضرت علی کی خلافت کے مساعد
نہ تھے اور اگر آپ خلافت کے دعویدار ہوتے تو کامیاب نہ ہوتے ۔ اصل حقیقت

کی شہادت کے بعد اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا تو وہ یک جہتی بھی مفقود
ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کبھی کوئی خالص شیعی حکومت قائم کرنے میں
کامیاب نہ ہوسکے۔ یہاں تک کہ مغرب میں فاطمی حکومت کو بھی ہم شیعی
حکومت اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ملک کے تمام افراد سنی تھے۔

بحث کے اس حصہ سے میرا مقصود یہ دکھانا تھا کہ شیعی تحریک ابتداء
میں نہ کوئی مذہبی تحریک تھی اور نہ اصولاً اسے مذہب اسلام سے علیحدہ کیا
جا سکتا ہے لیکن بعد کو اسے مذہب کے رنگ میں پیش کر کے محض سیاسی اغراض
کی بناء پر اسلام کے دو ٹکڑے کر دئے گئے۔

اسلام نام ہے صرف اعتراف وحدانیت و اقرار نبوت کا، اس میں
نہ خلافت و امامت شامل ہے نہ کوئی اور چیز، اگر اہل سنت خلفاء کی موجودہ
ترتیب کو درست و صحیح مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حضرت
علی کے غیر معمولی فضائل اور ان کی وصایت سے منکر ہوں اور اگر حضرات
اہل شیعہ خلافت کا اولین مستحق حضرت علی کو قرار دیتے ہیں تو اس سے لازم
نہیں آتا کہ وہ دیگر صحابہ کو کافر و منافق قرار دیں۔

اگر سنی، اسلام کی ضروری شرط یہ قرار دیتے ہیں کہ اعتراف توحید و
رسالت کے ساتھ ہی ساتھ ترتیب خلافت کا بھی اقرار ضروری ہو تو
میرے نزدیک وہ بھی اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں اور اگر شیعہ وصایت

۶۔ چونکہ رسول اللہ سے (باوجود معصوم ہونے کے) امور غیر الہامی مین اجتہادی غلطی کا امکان تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کا انتخاب حالات مابعد کے لحاظ سے مناسب نہ رہا ہو یا اگر مناسب بھی رہا ہو تو خلفا رسنے اس کے سمجھنے مین غلطی کی ہو۔ اور یہ غلطی ایسی نہین جس کا تعلق مذہب سے ہو۔

۷۔ حضرت علی کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کی امامت "نص قطعی" سے ثابت ہے کسی طرح درست نہین ہو سکتا کیونکہ کلام مجید اس باب مین بالکل ساکت ہے اور "نص قطعی" نام ہے صرف قرآن پاک کا۔ احادیث سے اسکا کوئی تعلق نہین۔

۸۔ شیعہ جماعت اول اول صرف ایک سیاسی جماعت تھی جس کا مدعا خلافت کو اپنے ذاتی مصالح یا خواہش نبوی کی بنا پر اہلبیت مین منتقل کرنا تھا اور امام حسین کی شہادت تک اس کی حیثیت صرف ایک ادارہ سیاسی کی سی رہی لیکن واقعۂ شہادت کے بعد اس جماعت نے اپنے سیاسیات کو مذہبی رنگ دینے کے لئے بعض مخصوص عقائد متعین کر لئے جن کو تعلیمات مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہین۔

۹۔ جمعیت اسلامیہ مین سب سے پہلے انتشار مذہب شیعہ نے پیدا کیا۔ اور پھر اس مین بھی باہم کر اتنے اختلافات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنا کوئی متحدہ سیاسی محاذ بھی نہ قائم رکھ سکا۔

سے رسول اللہ بھی واقف تھے اور اسی لئے آپ نے باضابطہ طور پر کھلم کھلا اپنی وفات کے وقت حضرت علی کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت نہین لی۔ اور خود حضرت علی بھی جانتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھون نے بھی نہایت خاموشی سے جمہور کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور کوئی مخالفانہ اقدام نہین کیا۔

۴۔ اسلام کا مدعا چونکہ ملوکیت و تقادم شخصی کو مٹا کر جمہوریت کی روح پیدا کرنا تھا اس لئے رسول اللہ یون بھی اپنے بعد کسی کو قطعی طور پر خلیفہ نامزد نہین کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اپنے خاندان مین ہمیشہ کے لئے خلافت و امامت کو منحصر کر دینا کہ یہ کھلی ہوئی ملوکیت کی طرفداری تھی۔ اگر رسول اللہ ایسا کرتے تو اُن مین اور دنیاوی فرمانرواؤن مین کوئی فرق نہ رہتا اور دنیا یہی کہتی کہ نبوت و رسالت کا یہ سارا ڈھونگ اسی لئے تھا کہ اپنے خاندان کے لئے سلطنت کی بنیاد قائم کر جائین۔

۵۔ چونکہ رسول اللہ عالم الغیب نہ تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہین تھا اس لئے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہلبیت مین کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا اور وہ مستحق امامت و خلافت ہوگا یا نہین اور اگر یہ کہا جائے کہ آل رسول کا اصلح و مکمل انسان ہونا حقائق ثابتہ مین سے ہے تو اس کے معنی یہ ہون گے کہ اسوقت بھی تمام سادات کو انھین صفات سے متصف ہونا چاہئیے، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

(۵)

خلافت و امامت

اس مسئلہ پر پچھلے مہینے کے نگار میں جو محاکمہ میرا شائع ہوا ہے اسے خلاف توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متقشف حضرات ہنوز مطمئن نہ ہوں گے اور نہ شاید کبھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے جن نتائج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض جو حضرات شیعہ کے لئے قابل قبول ہیں اہل التسنن کے نزدیک غلط ہیں اور جو سنیوں کے موافق ہیں وہ شیعوں کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے اسلئے ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسائل کو بھی لے لیا جائے جو میرے مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آسکتے ہیں مثلاً۔

ا۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے۔ گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں؟

۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا

۱۰۔ اہل تسنن کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ رسول اللہ بلاشبہ حضرت علیؑ کی خلافت کے متمنی تھے اور اہل تشیع کو ماننا چاہیئے کہ رسول اللہ کی یہ خواہش بعض ناگزیر حالات واسباب کے ماتحت پوری نہ ہو سکی۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ

۱۱۔ امامت وخلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اس لئے حقیقتاً شیعہ سنی کی تفریق بالکل بے معنی ہے اور ان دونوں کا اختلاف صرف تاریخ وسیاست کا اختلاف ہے جو ایک علمی اختلاف تحقیق سے آگے نہیں بڑھتا۔

نیاز فتحپوری
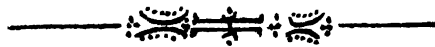
اور کسی خاندان کے لئے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہین -

چنانچہ مین ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دیتا ہون کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائین اور جہان تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال کرین جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور ذاتیًا قابل قبول نہین ہین -

مین اس بحث کے لئے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو مہینے کی مہلت دیتا ہون، اسکے بعد مجھے حق حاصل ہوگا کہ تمام شایع شدہ مضامین کے مباحث و دلائل کو سامنے رکھکر خود اپنی رائے پیش کرون - اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ جنوری کا پرچہ صرف اسی موضوع کے لئے وقف ہو (اگر ناظرین نگار نے اس کو پسند کیا)

مین اس دوران مین ایک استفتاء بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کرونگا اور جو جوابات مجھے موصول ہونگے ان سے مین اپنے محاکمہ کے وقت کام لونگا -

نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں ؟

۳۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے با خبر تھے، اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے ؟

۴۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے ؟

۵۔ وصایت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں ؟

۶۔ امامت کا بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے ؟

۷۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے، اس کو غلط قرار دینے کے لئے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے۔

۸۔ امام منتظر یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

۹۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں۔ اگر پڑا تو کیا ؟

۱۰۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے ؟

۱۱۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا

اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیون مین میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخبارون کی دنیا مین غلغلہ ہو گیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر " اطمینانی سکون " چھا گیا گویا وہ سمجھے کہ ڈگری بالکل ہمارے موافق ملی -

اسکے برخلاف شیعی جماعت اُس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی جبتک کہ مسئلہ زیر بحث تھا لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شایع ہوا اور شیعی جماعت مین اضطراب پیدا ہو گیا۔ گویا تمام اُمیدون پر پانی پھر گیا۔ کوئی مجھ غریب کو کوسنے دیرہا ہے کہ اس نے نگار مین اس بحث کو شایع ہی کیوں کیا۔ کوئی نگار کے محاکمہ کا سخت سے سخت اور مناظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے -

مگر مجھے اس سب پر مسرت ہی کہ مین نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھولکر علمی دنیا مین چہل پہل پیدا کر دی اور موجودہ صورت حال پر ہنسی آتی ہے کہ یہ نتیجہ اُلٹا کیونکر ہو گیا -

میرے خیال مین مدیر نگار نے جہانتک میرے زاویہ بحث کا تعلق ہی فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعی اصحاب متفق تھے تو انھین فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہئیے تھا اور جہانتک مدیر نگار کا فیصلہ مخالف نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اُس پر سنیون کو بھی اسی حد تک برافروختہ ہونا چاہئیے تھا جس حد تک شیعون کو -

(۶)

مسئلۂ خلافت و امامت

اور

محترم مدیر "نگار" کا محاکمہ

(ہرنام کے قلم سے)

مارچ ہی مارچ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شایع ہوا تھا۔

جو صاحب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے نگار میں مضمون اس توقع پر لکھا تھا کہ مدیر نگار میری رائے سے حرف بحرف موافقت ہی کر لیں گے وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ و سنی کسی جماعت سے کوئی جانبدارانہ تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعی مذہب کے موافق نظر آئی ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں "سطحیت" بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے اور ان کی نگاہیں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔

ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبداللہ بن جبن کا شمار ضعفار مین ہے۔ رہ گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباس سو ان کا اُسوقت وہان موجود ہونا ثابت نہین "۔

مجھے بہر حال مدیر نگار کی آزاد راے کا احترام ہے لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ اُنھون نے جو کچھ اس روایت مین شکوک ظاہر کئے ہین وہ عام اہلسنت کی جانب سے پیش نہین ہوسکتے اس لئے کہ اُن کے قواعد کی بنا پر روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اُس کی صحت و ثاقت کے لئے کافی ہے جس کے بعد راویون کی جانچ پڑتال کا سوال ہی باقی نہین رہتا پھر اگر ہر ایک سند مین کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخر تین چار الگ الگ راویون کے طریق سے روایت کا وارد ہونا بھی تو ایک قابل لحاظ چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت مین کوئی ایسی بات نہین ہے جس کو غلط طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہو سکے۔ جبکہ اُس کے راویون مین کوئی ضعیف ہو۔ غیر ثقہ ہو۔ غلط گو ہو مگر "رافضی" کوئی ایک بھی نہین ہے کہ یہ سمجھا جاسکے کہ صرف حضرت عمر پر رسول کی بارگاہ مین بے ادبی کا الزام لگانے کے لئے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ رسول آخر لکھنا کیا چاہتے تھے؟ اسکو صراحت کے ساتھ تو مین بیشک نہین دکھلا سکتا جبکہ وہ لکھا ہی نہین گیا لیکن مین نے جس ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون مین

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے
نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلہ امامت پر خالص اعتقادی حیثیت سے روشنی
ڈالی گئی ہو۔ اسی لئے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا پتہ بھی
نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر دکھلایا
تھا کہ حضرت پیغمبر کا منشا یہی تھا کہ حضرت علی ان کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔
اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک
یہ کہ ان واقعات کو صحیح تسلیم کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ
ان واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مدیر نگار کا فیصلہ ان دونوں جزوں میں میرے
بالکل موافق ہے۔

انھوں نے میرے پیش کردہ تمام روایات تاریخی کو تسلیم کیا ہے صرف
ایک روایت واقعۂ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ "اس کا تعلق اول تو صاحب
جناب امیر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کاغذ
و قلم منگوا کر کیا لکھوانا چاہتے تھے۔) اور دوسرے یہ کہ محدثین اہل السنن کے
نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک
یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دئے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیصہ
ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں، تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ ک

ختم ہوگئی۔ حضرت رسول کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لئے
اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا، یقیناً اور اگر ظاہر نہین کیا تو ہم کو اور
محترم مدیر نگار کو اس کی خبر کیونکر ہوئی ؟

اب یہ کہ آپ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپ کی خواہش کا پورا ہونا
ممکن تھا یا نہین ؟

یہ تنقیحیں ہین جو اب قائم کی گئی ہین اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہین
ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہوسکے ؟

یہ چیزین میری بحث سے خارج ہین اور یقیناً اب یہ اعتقادی چیزین
ہین جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہین ہے۔

مین جہانتک سمجھتا ہون مسلمانون کا عقیدہ رسول کی نسبت یہ رہا ہے
کہ آپ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہین ہوتا تھا اور یہ کہ آپکی
ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر "مدیر نگار" اس مسئلہ مین اختلاف رکھتے ہین تو یہ ویسے بہت سے
مسائل مین داخل ہے جو عام مسلمانون مین متفقہ حیثیت رکھتے ہین لیکن مدیر
نگار کو اپنی "حریت رائے" کی بنا پر ان سے اختلاف ہے جیسے بہشت و
دوزخ۔ ملائکہ۔ معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ۔

غالباً شیعی صحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلہ امامت اور نبوت کا چولی دامن کا

درج کیا ہے اُس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ دیکھا جاتا
ہے کہ پیغمبر اپنی تقریر مین "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر یہ فقرہ
کہہ چکے تھے کہ :۔ "انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی

اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی"۔

اور اسکے بعد دوات قلم مانگتے وقت آپ فرماتے ہین :۔ "اکتب لکم
کتابا لن تضلوا بعدہ" اس سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ تحریر بھی اسی کے
متعلق ہونے والی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ
"ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے، اور کوئی ضرورت نہین" جبکہ مدیر نگار اسکو
تسلیم کرتے ہین کہ رسول کا منشا یہی تھا کہ حضرت علی خلیفہ ہون اور نیز یہ کہ
دوسرے صحابہ کو منظور نہین تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علی سے
رشک رکھتے تھے۔

بہرحال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات
کو مدیر نگار نے تسلیم کیا ہے اور آخر مین یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ :۔

"جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد مین
بالکل حق بجانب ہین کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علی آپکے بعد
جانشین قرار دئے جائیں"۔

بس۔ مین تو سمجھتا ہون کہ جہانتک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث یہان ہی

اسوقت سب سے بڑے "خلیفۃ المسلمین" ہین اسواسطے کہ عالم اسلامی کا زیادہ حصہ اُن کے زیر سلطنت وحمایت ہے اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جز سے بھی ہے جیسا کہ اب تک مسلمانون کا خیال رہا ہے چنانچہ "خلافت" کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ: "النیابۃ عن النبی فی امور الدین والدنیا" تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔

اگر اس مین یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضرات خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اسوقت بادشاہ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر مین سمجھتا ہون کہ شیعی اور سنی کا اختلاف باقی نہین رہ سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرات اہلسنت اس کو گوارا نہین کرین گے۔ وہ حضرات خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہین اور یہین سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

یہ استدلال کہ "رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب مین نہین کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا" ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہانتک مجھے معلوم ہے شیعہ اصحاب وحی کی ہدایت کو اس باب مین قرآن مجید سے بہت شد و مد کے ساتھ ثابت کرتے ہین اور علمائے اہلسنت ہی کے روایات

ساتھ ہے یعنی اگر نبوت میں وہی معیاری حیثیت مسلم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ
ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفقہ ہے تو امامت کے
مسئلہ کا شیعوں کے حسب دلخواہ طے ہونا ضروری ہے۔ بے شک اگر
اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدۂ رسالت ہی
اُس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے۔ اور شاید شیعوں کی جانب
سے امامت کو "اصول دین" میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے یعنی وہ
اس کو نبوت کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور "ایمان بالنبی" کے تحت میں
اُس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

یہ امر کہ مسئلہ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے یا نہیں؟ میرے طے
کرنے کا نہیں ہے لیکن جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر نگار حضرت
پیغمبر کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلم مذہب ہونے کی اور دوسرے
حاکم و منتظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب کے ساتھ اسی وقت تک نہیں
ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا
جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور
اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرمان روا جس سے انتظام ملک
ہو جائے وہ خلیفۂ رسول سمجھا جانا چاہیے یہاں تک کہ اعلیٰحضرت ملک معظم تاجدار برطانیہ

دکھاکر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور معاہدہ کرنے کا حق کونسا تھا؟

اب سوائے اس کے کہ "بزمی صاحب" کی طرح اس کو صرف "حوصلہ افزائی" پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار ہے؟ مگر اس معاملہ میں مدیر نگار فرما چکے ہیں کہ "یہ ایک ایسا دعوے ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے"۔

یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبہ حجۃ الوداع جس میں محترم مدیر نگار کے الفاظ میں" رسول اللہ نے اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے"۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیئے"۔

اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے یہ آخری تقریر ہے جو رسول اللہ نے اتنے بڑے مجمع میں کی - اس کے بعد آپ دو مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے - اس کے بعد یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ "رسول اللہ نے جب آپکے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار کرلی"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی

سے اس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہین ۔
کاش اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہار خیال کیا جائے جسے میرے خیال مین مدیر نگار بخوشی شائع کرین گے تاکہ بحث کے تمام پہلو سامنے آجائین ۔

مجھے بیشک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے مین نے اپنے گزشتہ مضمون مین پیش کر دیا ہے اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیر نگار نے مہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہے تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے ہے کہ رسول اللہ چاہتے ضرور تھے کہ جناب امیر خلیفہ قرار پائین مگر آپ نے اس کا اعلان نہین کیا، اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہین لی ۔
جبکہ ہمارے سامنے یہ واقعہ ہے کہ بعیت عشیرہ مین رسول نے اعلان کیا ۔
"فایکم یوازرنی علی ھذا الامر علی ان یکون اخی و وصیی و خلیفتی فیکم" کون تم مین سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے" علی اٹھے اور کہا کہ مین آمادہ ہون حضرت نے یہ سنکر فرمایا کہ ۔ " دیکھو یہ ہے میرا بھائی میرا وصی اور جانشین" ۔
اب بتلائیے کہ اگر روح جمہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسول اس معاملہ کو اپنے ذمہ نہ رکھین اور عام مسلمانون پر چھوڑ دین تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سب تبلیغ

لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کیون کسی کو یہ
کہنے کا موقع ملتا کہ آپ خلافت ہی کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرم کے بار بار وہ الفاظ کہ مین تم مین دو گرانقدر چیزین
چھوڑتا ہون جن سے تمسک کی صورت مین تم گمراہ نہ ہوگے - اور پھر آپ کا
یہ کہنا کہ " ایسا نوشتہ لکھدون جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہو " اور پھر حضرت
عمر کا یہ فقرہ کہ " ہم کو بس کتاب خدا کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہین "
کیا اس کے یہی معنی پیدا نہین ہوتے کہ حضرت عمر کو اپنی فراست کی بنا پر یہ یقین
ہوگیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہین جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہین جس مین آپنے
کتاب خدا کے ساتھ اپنی عترت اور اہلبیت کو ضم کیا ہے اور ان دونون
کی پیروی کو ذریعۂ نجات قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر آپنے یہ کہا کہ ہمارے
لئے تو بس کتاب خدا کافی ہے۔ یعنی کسی دوسرے جز کی ہم کو ضرورت نہین ہے
یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورت حال در حضرت
عمر کے اس فقرہ پر غور کرنے سے سوائے اس نتیجہ کے کچھ سمجھ ہی نہین سکتا۔
بے شک افتر قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہ کا وصال نہین ہوا لیکن بے ہوشی
و حواس کے عالم مین اتنا وقت ملا کہ آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت
عمر نے جن مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا۔ (جن کا صحیح بخاری
مین تذکرہ موجود ہے) ان کے بعد کوئی محل آپ کو اپنی خواہش کے پورا کرنے کا

رسول نے سکوت نہین کیا۔ اُس وقت جب آپ مرض الموت مین مبتلا ہو چکے
ہین۔ جبکہ آپکے وصال مین صرف چند روز باقی تھے اُس موقع پر بھی
آپنے تقریر کی اور فرمایا:۔ "اے لوگو بہت قریب ہے، وہ وقت کہ مین دنیا
سے اُٹھ جاؤن اور تم سے رخصت ہون مین نے اس سے قبل تم سے سب کچھ
کہدیا ہے اور حجت تمام کردی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مین تمھارے
درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جاتا ہون"۔
یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بلند کرکے فرمایا:۔
"علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ، یہ دونون جدا نہ ہونگے
یہانتک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہونچین۔ مین ان سے دریافت کرونگا
کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا۔ (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۵)
دیکھے جائین یہ الفاظ کہ:۔ " قد قدمت الیکم القول معذرۃ
الیکم"۔ " مین تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہون اور حجت تمام کردی ہے"۔
اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسول نے اعلان کیون نہ کردیا۔ بیشک
اس کے بعد صرف ایک ہی چیز باقی تھی اور وہ تحریر۔ اُس کا رسول نے
بندوبست کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری مین واقعہ قرطاس کی صورت مین
تذکرہ ہے۔
کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے؟ بے شک کیا معلوم!

لشکر اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام مضر عناصر سے
چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دیں اور اُس کے لئے اتنے تاکیدی احکام نافذ کئے
تھے کہ "خدا کی لعنت ہے اُس پر جو لشکر اسامہ میں نہ جائے" مگر آپ کی
عدول حکمی کی گئی جس کے بعد آپ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

محترم مدیر نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بیشتر صحابہ کو حضرت
علی سے رشک و رقابت اور عداوت تھی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپ کے
خلاف متفق تھے۔

اس صورت حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علی کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن
تھا، بے شک غیر ممکن تھا، لیکن اس سے تمام اصحاب الزام سے بری
تو نہیں ہو جاتے۔

فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ، رئیس، امیر کبیر کے تمام ملازمین
اُس کے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں یقیناً اُس کا قتل ہو جانا
اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بنا پر قاتل بالکل بری قرار پا جائینگے

اس صورت میں کیا جماعت مسلمین، عقیدت مندان رسول کو آزادانہ
طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیئے تھا کہ
جو کچھ ہوا وہ رسول کی مرضی کے خلاف ایک متفقہ بندوبست کا نتیجہ تھا
جو قابل افسوس ہے۔ نہ یہ کہ اس کے برخلاف "الصحابۃ کلھم عدول"

باقی نہ رہا تھا۔

وہ یہ کہ آپنے فرمایا تھا کہ "رسول پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپکے ہوش و حواس جا چکے ہیں"

بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ "ان الرجل لیہجر" "آپ ہزیان بک رہے ہیں" آپ کے اس فقرہ کا حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ رسول جو کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ قلم دوات حاضر کردو اور بعض لوگ کہتے تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمر نے ارشاد کی یعنی واقعی رسول کے ہوش و حواس درست نہیں رہے۔ اب آپ فرمائیے کہ اس کے بعد رسول کو کب موقع تھا کہ کچھ تحریر کراتے اور اگر کچھ لکھواتے بھی تو وہ مستند کب سمجھا جاتا جب کہ بخیال حضرات "بحالت صحت نفس و ثبات عقل" کی شرط ہی مفقود تھی۔

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنی احباب سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں تو تاریخی واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسول کا مقصد کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور اس سازش کے ارکان اتنے اندر دنی تھے کہ رسول اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی سازش کے توڑنے کے لئے آپنے

پھر جبکہ پیغمبر نے اپنے انہی اظہارات مین جنھین محترم مدیر نگار بھی اعلان نہین لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہین اور یہ کہ اُن کا منشا یہ تھا کہ اگر انتخاب کی نوبت آئے تو رسول کا ووٹ علی کے حق مین سمجھا جائے) اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہین پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا جیسا کہ (لن تضلوا) کے الفاظ بتا رہے ہین۔ نیز یہ کہ " مین روز قیامت دریافت کرون گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟"

تو اب بتائیے کہ اس چیز کو مذہب سے الگ اور اخروی جزا و سزا سے غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہر حال جیسا کہ مین نے اپنے دوسرے مضمون مین تحریر کیا ہے اس وقت مسلمانون کے لئے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی مین کن پیشوایان دین کو اپنا رہنما قرار دین اور اُن کے تعلیمات پر عمل کرین۔"

اگر یہ مسئلہ اسوقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت سے عترت رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کر لین اور احکام و تعلیمات مذہبی مین اُنہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگین تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہین رہتا۔ اس لئے کہ خلافت بمعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے

"صحابہ سب کے سب عادل ہین کے کلیئے بنا لئے جائین اور غزوہ بدر، بیعت شجرہ وغیرہ کے پیغامون کو بلا استثنا سب کے رستگار، نیکوکار ہونے کی قطعی سند قرار دے لیا جائے اور " اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" کی سی روایتون کو رسول کی زبانی بیان کرکے ہر ایک کی پیروی کو ذریعہ نجات سمجھ لیا جائے۔

محترم مدیر نگار کو یہ تسلیم ہے کہ " خلفائے ثلثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہین کیا گیا، لیکن جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کئے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا"

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ " ذاتی اثرات " رسول کے منشا کی موافقت مین کام نہین آسکتے تھے اور جب ایسا نہین ہوا تو مخالفت رسول کی ذمہ داری کیا اب انہی " ذاتی اثرات " والی ہستیون پر عاید نہین رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت مین ان لوگون سے اظہار اختلاف صرف رسول کے ساتھ بجا (یا بیجا) عقیدت کا نتیجہ قرار نہین پاتا لیکن ہم یہ دیکھتے ہین کہ معاملہ بالکل برعکس ہوگیا یعنی حضرات اہلسنت محبت رسول کے تنہا دعویدار بن گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دیا گیا کہ ان کو رسول اللہ سے کوئی خاص تعلق نہین ہے"

اس سے قبل بارہا استعمال ہوچکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔
جس حد تک روایات کا تعلق ہے یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہل سنت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کر کے اس حقیقت کے مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا اسی کے ساتھ اہلسنت کا مناظرانہ پہلو اسلئے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعی حضرات خود اہلسنت کی روایات سے حضرت علی کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اسلئے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہ حضرت علی کو اپنا جانشین و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں، بیکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ (اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد) نفس مسئلہ امامت پر گفتگو کیجائے یعنی یہ کہ اسکی اہمیت مذہب اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ کیا جناب امیر کی امامت واقعی منصوص تھی یا نہیں۔
اسی لئے میں نے ماہ مارچ ۱۹۳۰ء کے نگار میں چند مباحث متعین کر دئیے تھے۔ اور چاہتا تھا کہ شیعی علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہین جن کا کوئی تعلق آیندہ نسلون کے ساتھ ہو ہی نہین سکتا۔ اسلئے اگر حضرات خلفار کی حکومت کو اس حیثیت سے اُن کے زمانہ مین تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانون کے ساتھ اُس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہین ہوتا اور اس لئے موجودہ زمانہ مین شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہین رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کامیاب ہو اور مسلمانون کی باہمی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جا سکے "حقیقی اسلام"۔

بس مجھے اب اس سلسلہ مین کچھ کہنا نہین ہے۔ مدیر نگار نے جو تنقیحات قائم کئے ہین اُن پر اہلسنت اور شیعہ مذہب کے علمار کو بحث کرنا چاہیے اس لئے کہ زاویہ بحث اب ایسے نقطہ پر پہونچ گیا ہے جو ایک "ہندو" کے دسترس سے باہر ہے۔

"ہرنام"

(نگار) گزشتہ فروری کے نگار مین مسئلہ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد اسوقت تک متعدد مضامین شیعہ و سنی حضرات کے موصول ہوئے لیکن اُن کو شایع نہین کیا گیا کیونکہ جو طریق استدلال ان مین اختیار کیا گیا ہے وہ یا تو بکسر مجادلانہ ہے یا پھر اُس انداز کا جو

اب جناب ہر نام کا (جو اس تحریک کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ بھی میرا محاکمہ دیکھنے کے بعد اب اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعی علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام ان مباحث کو سامنے رکھکر جو ماہ مارچ ۳۶ء کے نگار میں درج کئے گئے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد سنی علماء کو متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دیں لیکن دونوں فریق سے میری التجا ہے کہ جو کچھ وہ لکھیں اس میں کوئی مجادلانہ پہلو نہ ہونا چاہیئے، نیز یہ کہ روایتی استدلال میں وہ صرف فریق مخالف کی کتابوں کو سامنے رکھیں، ورنہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھکر ہمیشہ سبھی نے بحث کی ہے اور اسی لئے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔

(تمام شد حصہ اول)